گجرات سانحہ (۲۰۰۲) کے پس منظر میں
افسانے، نظمانے اور منی کہانیاں
کوثر صدیقی

محترم المقام عالی جناب شارب ردولوی صاحب

کی خدمت میں

ادب و احترام کے ساتھ

کوثر صدیقی

۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۲
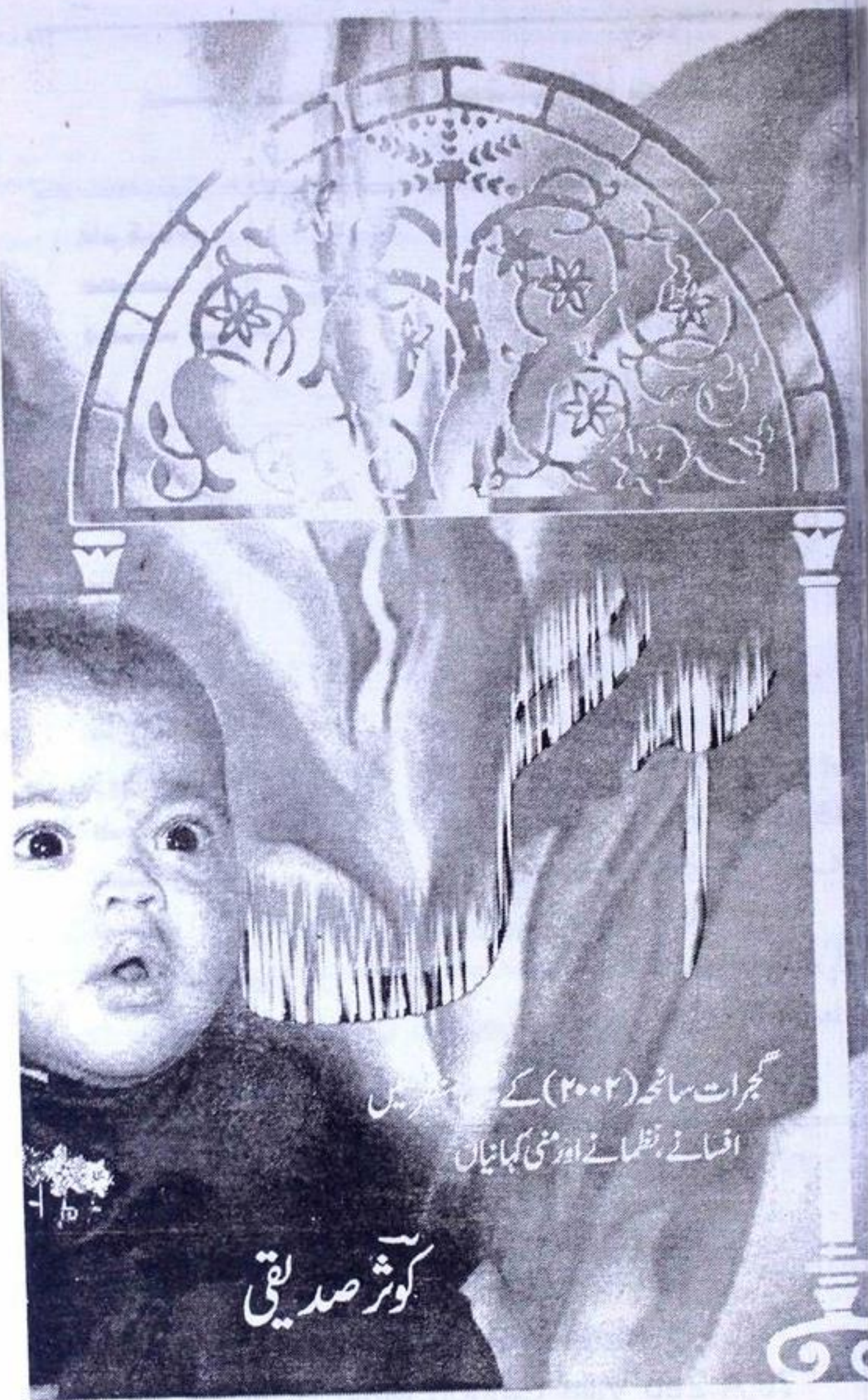
گجرات سانحہ (۲۰۰۲) کے پس منظر میں
افسانے، نظمانے اور منی کہانیاں
کوثر صدیقی

دبستان بھوپال کی چوتھی فخریہ پیش کش

کوثر صدیقی کی آٹھویں کتاب

نام کتاب	:	آگ
مصنف	:	کوثر صدیقی
مصنف کے پتے	:	(۱) زیب ولا، گنوری مین روڈ، بھوپال 462001 فون نمبر۔542731 (۲) D-1/2، فلیٹ نمبر 4-503، یمنا نگر، لوکھنڈ والا، اندھیری (ویسٹ) ممبئی 400053 فون نمبر 6327809
ناشر	:	کوثر صدیقی
تعداد	:	چارسو
صفحات	:	۱۲۸
سال اشاعت	:	۲۰۰۲ء
زیر اہتمام	:	دبستان بھوپال، زیب ولا، گنوری مین روڈ بھوپال
طباعت	:	آلوک پریس، تلیا، بھوپال 462001
کمپوزنگ	:	محمد افروز قاسمی (ایکیٹو کمپیوٹر سینٹر فتح گڑھ۔ بھوپال)
قیمت	:	روپے -/100
ملنے کے پتے	:	۱۔ دبستان بھوپال، زیب ولا، گنوری روڈ، بھوپال ۱۔ ۲۔ مرکز ادب، ایم ایل بی گرلز کالج روڈ، بدھوارہ، بھوپال

AAG

SHORT STORIES

By

Kausar Siddiqui

79,A Zeb Villa Ginnori Main Road

Bhopal-462001

Price. Rs 100/-

ترتیب

حصہ اوّل

گجرات المیہ (۲۰۰۲) کے پس منظر میں لکھی گئیں کہانیاں

حصہ دوم - نظمانے

حصہ سوم

غیر مطبوعہ منی کہانیوں کے مجموعے "فسانہ بھی حقیقت بھی"

کی منتخب کہانیاں

۱۹۷۲ کی نگارشات

۱۹۹۷ کی نگارشات

حقیقتوں کی یہ کہانیاں......اقبال انصاری

تقسیمِ ہند کے فوراً جو فسادات ہوئے تھے انھیں کچھ نامور قلم کاروں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر انھوں نے ان فسادات کو موضوع بنا کر چند تحریریں پیش کی تھیں۔ ایسی ہی ایک کوشش رامانند ساگر نے کی تھی اور ایک ناول لکھا تھا ''اور انسان مر گیا''۔ میں ہندی میں لکھے اس ناول پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا...... چونکہ فساد کے موضوع پر لکھا گیا تھا وہ ناول اس لئے اُس کا تذکرہ بھر کر رہا ہوں۔ دوسری کتاب جو فسادات کے موضوع پر آئی تھی وہ تھی کرشن چندر کی ''ہم وحشی ہیں''۔ یہ کہانیوں کا مجموعہ تھا جسے اردو کے افسانوی ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ منٹو کی کچھ کہانیاں آئی تھیں جن میں ''میرے خیال میں'' ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' اپنے موضوع، ٹریٹ منٹ اور فنی بلندی کے اعتبار سے اردو ادب کی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب کی منفرد کہانیاں ہیں...... فساد کو موضوع بنا کر کرشن چندر اور منٹو نے ہولناک کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں جب بھی مرے ہیں، افراد مرے ہیں، ''انسان'' نہیں مرا ہے۔

''انسان'' مر بھی نہیں سکتا۔ افراد مر سکتے ہیں، افراد مرتے ہیں۔ اگر ''انسان'' مر گیا تو دنیا ختم ہو گئی۔ دنیا کا قیام اس امر کی دلیل ہے کہ انسان زندہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں فرقہ وارانہ فسادات میں گیارہ لاکھ اُنسٹھ ہزار افراد مارے۔ لیکن ''انسان'' زندہ رہا۔ اُسے نہ تقسیم کے فسادات مار سکے نہ بیسویں صدی کے تقسیم کے بعد کے فسادات، اور نہ اکیسویں صدی کے گجرات کے فسادات......

کوثر صدیقی کے افسانوں کے مجموعے ''آگ'' سے جو MESSAGE نکل کر FLOAT کر رہا ہے وہ یہی ہے کہ ''انسان'' نہیں مرا ہے، انسانیت زخموں سے چُور چُور تو ہو گئی ہے، لیکن زندہ ہے۔ اکیسویں صدی کے ... ے سال کے شروع کے چھ ماہ کے گجرات سے گذرنے کے بعد بھی اگر کسی کے ہاتھ سے رجائیت کا دامن نہ چھوٹے تو میں اسے بڑا آدمی کہوں گا۔ اور اس لحاظ سے کوثر صدیقی بڑے آدمی ہیں، بہت بڑے آدمی ہیں۔ اُن کے

اس مجموعے کے حصہ اوّل کی تمام کہانیاں فساد کا موضوع یا فساد کا پس منظر لئے ہوئے ہیں۔ایک حساس اور دردمند صاحبِ قلم ہونے کے ناتے انھوں نے بڑی گہری نگاہ سے فسادات کا مشاہدہ کیا ہے، جائزہ لیا ہے۔اُن کی اِن کہانیوں کی جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے اور جس کے لئے وہ شانے پر ایک والہانہ شاباشی تھپکی کے مستحق ہیں وہ ہے اُن کا ATTITUDE-ان کی تنقید کا نشانہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان...... بلکہ بُرے اعمال، قبیح افعال، منفی سوچ اور گمرہی ان کی تنقید کا نشانہ ہیں۔

کوثر صدیقی نے صرف شعلے ہی نہیں دیکھے ہیں، شبنم پر بھی ان کی نگاہ گئی ہے۔انھوں نے صرف جلتے ہوئے گھر اور آنگن ہی نہیں دیکھے ہیں۔فساد کے ان شعلوں میں اگر کہیں سونا تپ کر کندن بن رہا ہے تو ان کی نگاہ اس کندن پر بھی گئی ہے۔اور اب ایک تعمیری ادیب کی حیثیت سے انھوں نے جلتے ہوئے مکانوں سے زیادہ اُس کندن کو HIGHLIHT کیا ہے۔''مانو سیوا سمیتی'' ''کچے دھاگے کی طاقت'' ''ایثار'' اور ''رمن اور حسن'' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

ان کہانیوں میں کچھ بھی ایسا نہیں جو IMBALNCED ہو......زبان ہو یا بیان، غم ہو یا غصہ...... ہر چیز پوری طرح سے متوازن ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شاید کچھ نابالغ ذہن کوثر صدیقی کو برہنہ حقیقت نگاری اور بے درد واقعہ نگاری کا مجرم ٹھہرائیں، لیکن اتنا تو وہ بھی تسلیم کریں گے کہ اس برہنہ حقیقت نگاری اور اس بے درد واقعہ نگاری میں بھی ہر جگہ توازن ہے۔ مصنف نے کہیں بھی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔لیکن حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے جیسے کوئی سرجن کسی زخمی کے زخموں کو اپنی رپورٹ میں بیان کرتا ہے۔یا جس طرح ایک کیمرے کی غیر جذباتی آنکھ کسی کریہہ منظر کو قید کرتی ہے۔

کچھ کہانیاں بہت مختصر اور بہت خوبصورت ہیں۔ دراصل ان کا اختصار ہی ان کی خوبصورتی ہے۔''رمن اور حسن'' قاری کے ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہے۔

حقیقتوں کو کہانی بنانا بڑا آسان ہے۔لیکن حقیقتوں کی کہانی پوری غیر جانبداری کے ساتھ لکھنا بہت مشکل ہے۔ یہ بہت مشکل کام کوثر صدیقی نے ان کہانیوں میں بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔امید ہے کہ ان کہانیوں کے بالغ نظر قاری ملیں گے اور ان کی اچھی پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆

ایف 176-پانڈو نگر-دہلی 110091

۲۲رجون ۲۰۰۲ء
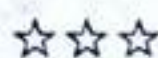
آنسو، بے زبانوں کی زبان

کوثر صدیقی

آنسوؤں کی زبان نہیں ہوتی لیکن اُن کے امنڈنے میں اُس طغیانی کے پیش خیمے کی آواز ہوتی ہے جس کے بہاؤ میں تہذیبیں غرق ہو جاتی ہیں۔ آنسوؤں کا زمین سے کوئی رشتہ نہیں لیکن آنسو زمین میں پیوست ہو کر دہکتی ہوئی اُس آگ کی تاریخ لکھتا ہے جو والا مکھی کی شکل میں پھٹ کر بستیوں کو لاوے کی آغوش میں سُلا کے دنیا کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ جسے ہزاروں سال بعد کا مورخ کھود کھود کے پڑھتا ہے۔

ظلم ایک شیطانی خصلت ہے جو آدمی کے خمیر میں شامل ہے۔ ظلم کا وجود ظالم و مظلوم کو جنم دیتا ہے۔ ایک قابیل ہے تو دوسرے کا ہابیل ہونا بھی ضروری ہے۔ ہابیل کے آنسو تاریخ کے صفحات پر نقش نہیں لیکن قابیلیوں کے ظلم کے نتیجے میں تہذیبوں کے دفن ہو جانے کے آثار زمین اپنے سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ یہ آثار آنسوؤں کے نقوش ہیں۔

گجرات المیے کے آنسو مظلومین تک ہی محدود نہیں اِس المیے سے ہر وہ شخص مجروح ہُوا ہے جسے انسان کہا جائے بشرطیکہ اُس کا انسانیت سے رشتہ ہو۔ جہاں انسان شیطان کا مرید ہو جائے وہاں امام حسینؑ کے سرِ مبارک کو نیزے پر اُٹھا کر چلنا بھی باعثِ فخر و فتح سمجھا جاتا ہے۔ کاغذ قلم سے جن کا ادبی رشتہ ہے وہ عام انسان سے نسبتاً کچھ زیادہ حساس ہوتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اظہار کی صلاحیت اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ گجرات کے المیات کے جُزئیات اخبارات میں مسلسل پڑھتے رہنے اور ٹیلی ویژن پر دیکھتے رہنے کے بعد آنسوؤں کا کاغذ پر نقش ہونا فطری عمل تھا۔ پہلے ایک نظم کہی، پھر کچھ غزلیں، دوہے اور نظمانے بھی کہے۔ لیکن شاعری رمز و کنایہ کی زبان ہے اس لیے کچھ لکھ

کر بھی کچھ نہ لکھنے کا احساس ہُوا۔ گجرات کی اِس نئی کربلا میں مظلومین اور مہلوکین پر جو گذری اُسے لکھنے کا فرض تو مورخین کا ہے لیکن بہ حیثیت ایک قلم کار مظلومین کی ’’آپ بیتی‘‘ کو ’’جگ بیتی‘‘ کے انداز میں، قارئین کی دل چسپی ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے، بیان کرنے کے لیے مجھے افسانہ موثر صنف نظر آیا۔ گجرات میں جیسا ہُوا، جیسا گذرا، جیسا سُنا، جیسا پڑھا اور دیکھا، اُسے افسانوی رنگ میں پیش کرنے کی یہ ادنےٰ کوشش ہے۔ میں فنِ افسانہ نگاری سے واقف نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ مظلومین کا دُکھ درد سمجھنے میں یہ کہانیاں قارئین کی رہ نمائی کرسکتی ہیں۔ اِن کہانیوں کے واقعات، پلاٹ، منظر نامے اور کردار وغیرہ خیالی ہیں اور حقیقت یا اصلیت سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس سے پہلے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں جنھیں ’’فسانہ بھی حقیقت بھی‘‘ کے عنوان سے مجموعے کی شکل میں ترتیب دے رکھا ہے۔ یہ افسانے ہیں یا کہانیاں یا کچھ اور، یہ فیصلہ میں بھی نہیں کرسکا ہوں۔ اقبال مسعود نے مذکورہ مجموعہ پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اِن کہانیوں میں ’’کوئی نہ کوئی واقعہ یا فکر کا پہلو موجود ہے.........اور ۱۹۷۷ اور ۱۹۹۷ میں ہونے والے سیاسی، ادبی، سماجی، ملکی اور عالمی واقعات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ افسانہ نگار تاریخ نہیں لکھ رہا ہے وہ حقائق کو خام مال کے طور پر اپنے افسانے میں استعمال کرتا ہے۔ اُن سے اپنی کہانی کی بنت کرتا ہے یا اُس کو مہمیز دیتا ہے۔ اِن فن پاروں میں کردار بھی موجود ہے اور مکالمہ بھی سنائی دیتا ہے، منظر نامہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ ابتدا اور اختتام بھی موجود ہے اس کے باوجود اسے افسانہ کہنے میں تکلف مانع ہے‘‘۔ بہر کیف ایک درمیانی ضخامت کا مجموعہ شائع کرنے کی غرض سے مذکورہ مجموعے سے بھی کچھ کہانیاں شامل کردی ہیں۔

اس مجموعے کی کہانیاں پیش کرنے میں میں کامیاب ہوں یا ناکامیاب اِس فیصلہ ناقدین اور قارئین ہی کرسکتے ہیں

☆☆☆

یکم ستمبر ۲۰۰۲

انتساب

گجرات المیہ (۲۰۰۲) میں

- اُن خواتین کے نام جو بیوہ ہو گئیں
- اُن مردوں کے نام جن کے جیون ساتھیوں کو فساد نما دہشت کا دیو نگل گیا۔
- اُن دوشیزاؤں اور خواتین کے نام جن کی آبرو لٹ گئی
- اُن بچوں کے نام جو یتیم و یسیر ہو گئے
- اُن بچوں کے نام جو ماں کے بطن میں ہی شہید کر دیئے گئے
- اُن لوگوں کے نام جو خانماں برباد ہو گئے

اور

- اُن کے نام بھی

جن کی آنکھیں، کان اور منھ بند ہیں، اور ضمیر بھی خاموش

حصہ اوّل

گجرات المیہ (۲۰۰۲)

کے پس منظر میں لکھی گئیں کہانیاں

۱۔"مانوسیوا سمیتی"

"نہیں میں شاکر ہی سے شادی کروں گی"۔روتے ہوئے ریتا نے چیخ کر کہا

"نہیں بیٹی، یہ شادی ممکن ہی نہیں ہے۔ایک مسلمان لڑکے سے ایک ہندو لڑکی کی کیسے شادی ہوسکتی ہے"۔ریتا کے باپ گھنشیام داس نے اُسے سمجھایا

"ہوسکتی ہے۔ہم کورٹ میرج کریں گے۔وہ اپنے دھرم پر قائم رہے گا، میں اپنے دھرم کا پالن کروں گی۔ہم دُنیا کے سامنے ایک مثالی شادی اور ہندو مسلم ایکتا کا بہترین نمونہ پیش کریں گے"۔ریتا نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا

"خوب سوچ لو۔زندگی کے فیصلے جذبات اور جوش میں نہیں، ہوش میں کیے جاتے ہیں"۔گھنشیام داس غصّے میں اپنے پاؤں زمین پر زور سے پٹکتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

ریتا اور شاکر ایک ہی محلّے میں رہتے تھے اور ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھ کر ہائر سیکنڈری کیا تھا۔کالج تک پہنچتے پہنچتے بچپن کی دوستی محبت میں تبدیل ہوگئی تھی۔دونوں خود کو زندگی کے طویل راستے کا ہم سفر مانتے ہوئے منزل کے خواب دیکھنے لگے تھے۔دونوں نے ڈاکٹر بننے کے بعد ایک مانوسیوا سمیتی، بنا کر انسانی خدمات کرنے کی اسکیم بنائی تھی۔اُن کا خیال تھا کہ مُلک کی ایک چھت کے نیچے رہ کر بھی

ہندو، مسلمان عیسائی الگ الگ خیموں میں بٹے ہوئے ہیں اُنھیں پیار اور انسانی خدمات کے ذریعہ ہی ایک کامن پلیٹ فارم پر لایا جا سکتا ہے۔

شاکر پری میڈیکل ٹیسٹ پاس نہیں کر سکا اس لیے وہ بی۔ ایس۔ سی اور ایل۔ ایل۔ بی کر کے وکیل بن گیا۔ ریٹا نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر کے خود کی ڈسپنسری کھول لی۔ ریٹا اور شاکر کے گھر والوں کو ان دونوں کے عشق و محبت کی خبر تو اُس وقت ہی لگ گئی تھی جب اِنھوں نے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں کے ماں باپ مغربی تعلیم یافتہ، روشن دماغ اور جدید خیالات کے تھے لیکن بین المذہب (انٹر کاسٹ) شادی کی اجازت دینے کی حد تک روادار بھی نہیں تھے۔ شاکر کے گھر والوں کی سوچ تھی کہ لڑکے کا معاملہ ہے۔ کھیلنے کودنے کے بعد سمجھ آ جانے پر خود راہِ راست پر آ جائے گا۔ اُنھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ریٹا کے گھر والے اِس شادی کے سخت مخالف ہیں۔ ریٹا کے ماں باپ سوچتے تھے کہ ریٹا شاکر سے جتنی بھی محبت کرتی ہو لیکن ایک مسلمان سے شادی کر کے خاندان کی رُسوائی کی حد تک قدم نہیں بڑھائے گی۔

اِسی زمانے میں شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مندر مسجد کے جھگڑے نے ہندو کو مسلمان سے اور مسلمان کو ہندو سے الگ کر دیا تھا۔ محلّہ محلّہ، کوچہ کوچہ باہمی نفرت کی گہری خندقیں کھُد گئیں تھیں جن میں گر کر ہندو مسلمان آپس میں دست و گریباں ہونے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے نفرت کی آگ دشمنی بن کر ہر دل میں سلگنے لگی تھی۔ آخر ایک رات کی سیاہ صبح کو فرقہ واریت کا دیو اپنے منھ سے آگ اُگل کر شہر میں دنگوں کے شعلے بھڑکاتا ہوا نفرت کی گہری خندق سے نکل پڑا۔ رام مندر نرمان کے کار سیوکوں کو گودھرا میں فتنہ خیز شیطانی طاقتوں کے ذریعہ جلا دینے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایسا لگا جیسے ہر گلی اور کوچے میں پہلے ہی سے

بارود بچھی ہوئی تھی صرف ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔

مکانوں دُکانوں کی آگ تو فائر بریگیڈ بجھا سکتے ہیں مگر دلوں کی آگ بجھانے والے محبت کے فائر بریگیڈ کی لاریوں کے ٹائر پھٹ کر اُن کے پہیے زمین میں دھنس گئے تھے۔اُن کا پٹرول ختم ہو چکا تھا۔اُن کو چلانے والے آگ میں جھلس جانے کے ڈر سے اپنی جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔شہر میں محبت کا کاروبار ٹھپ تھا صرف نفرت کا کاروبار اپنے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر نئی تاریخ لکھ رہا تھا۔اُس کے بیوپاریوں نے تلوار، خنجر، بھالے، بندوق، پستول اور بم بنانے کے کارخانے راتوں رات کھول لیے تھے جو چوبیسوں گھنٹے کام کرتے تھے۔شہر کے غنڈوں، بدمعاشوں کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کے جرائم پیشہ ادی واسیوں کو جمع کر کے اُنھیں ٹرینڈ کر کے توڑ پھوڑ، قتل، لوٹ اور آگ زنی کرائی جارہی تھی۔ اِس آتشیں کاروبار میں کرائے پر حاصل کیے گئے اِن لوگوں کو شراب و کباب اور ''شکار کا شباب'' بطور بونس مہیا کرنے کا بھی انتظام تھا۔خوب پیوتا کہ خوب نشے کی حالت میں انسانی خون بدمزہ نہ لگے۔آگ تھی کہ جنگل کی آگ کی طرح بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اِدھر تھمی اُدھر لگی۔ اِدھر لگی اُدھر بجھی۔کبھی گھٹی کبھی بڑھی۔انسانیت کا قتل ہو چکا تھا۔ ہر طرف شیطان ننگا ناچ دکھا رہا تھا۔خوف اور موت کے سیاہ سائے میں قتل، خون، لوٹ، آگ، بلاتکار، جلتی لاشیں، جلے اُدھ جلے مکانوں میں سڑتی لاشوں سے اُٹھتا تعفُّن۔جن ہاتھوں پر شیطان کے اِن ہاتھوں میں ہتھ کڑی ڈالنے کی ذمے داری تھی وہ الٹا شیطان کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔

ایسے ماحول میں جب کہ قانون کی کوئی گرفت نہیں تھی گھن شیام داس کے ذہن میں ایک اسکیم آئی۔اُس نے سوچا کہ اگر شاکر کو دنگوں کے بہانے ختم کرا دیا جائے تو کچھ دن رو پیٹ کر ریتا کو خود بخود صبر آجائے گا اور یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔دوسرے دن ہی خبر

ملی کہ دنگائیوں نے شاکر اور اُس کے ماں باپ کو سوتے میں پیٹرول چھڑک کر زندہ جلا دیا اور بعد میں گھر کو بھی جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ یہ خبر سُن کر ریتا چیخی ''شاکر میں زندہ ہوں۔ میں زندہ رہوں گی۔ میں تمھارا مشن پورا کروں گی''۔ اور تیزی کے ساتھ ماں سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گئی۔ ماں نے روکنا چاہا مگر جس کے قدم کسی مقصد کے حصول کے لیے اُٹھے ہوں اُسے کون روک سکتا ہے۔ گھنشیام داس کو خبر ملتے ہی وہ ریتا کی تلاش میں نکل پڑا۔ ہسپتالوں کے مُردہ خانوں میں، پولس کی مُردوں کی فہرست میں، قبرستانوں، شمشان گھاٹوں کے رجسٹروں میں کہیں ریتا کا نام نہ ملنے پر اُسے گہرا دکھ ہُوا۔ ایک روز وہ تلاش کے بعد مایوسی کی حالت میں پھر رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک ریلیف کیمپ (راحتی مرکز) پر پڑی۔ معاً اُس کے دل میں خیال آیا کہ یہاں بھی دیکھ لیا جائے وہ انفارمیشن کاؤنٹر (معلوماتی میز) پر گیا اور کیمپ میں پناہ گزینوں کا رجسٹر دیکھا۔ چند ورق پلٹنے پر ایک اندراج تھا۔

''ڈاکٹر ریتا شاکر بیوہ شاکر ایڈووکیٹ''

جلدی سے رجسٹر بند کر کے وہ کیمپ کے اندر گھُس گیا۔ تھوڑی دور پر ایک کپڑے کا سائن بورڈ تھا جس پر لکھا تھا۔

'' مانو سیوا سمیتی ''

اور وہیں ڈاکٹر مسز ریتا شاکر کرسی پر بیٹھی ہوئی پناہ گزینوں کے علاج میں منہمک تھی۔

☆☆☆☆

۲-عدالت کی آنکھیں

''ملزم موہن حاضر ہو''۔ چپراسی نے عدالت کے دروازے پر آواز لگائی۔
اور پولس نے ملزم موہن کو لے جا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ عدالت نے ملزم سے پوچھا۔
''تم نے اپنی فردِ جرم پڑھی ہے''۔
''نہیں مائی باپ، میں اَن پڑھ آدمی ہوں''۔ملزم نے کہا
''تمھارا کوئی وکیل ہے''۔عدالت
''نہیں مائی باپ، میرے پاس پیسے نہیں کہ وکیل کروں۔غریب آدمی ہوں''۔ملزم
''تم چاہو تو سرکار کی طرف سے تمھیں اپنے بچاؤ کے لیے وکیل دیا جا سکتا ہے''۔عدالت
''مائی باپ، سرکاری وکیل کیا بچاؤ کرے گا۔سرکار کا کام تو سزا ٹھونکنا ہے''۔ملزم
''دیکھو تم عدالت کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آ رہے ہو، جانتے ہو اِس کا نتیجہ''۔عدالت
''ہاں مائی باپ، بغیر محنت کے آپ کا ایک کیس نپٹ جائے گا''۔ملزم
''دیکھو تم حد سے بہت آگے بڑھ رہے ہو۔صاف صاف کہو تمھیں جرم منظور ہے یا نہیں''۔عدالت
''مائی باپ، اگر مجھے ملزم بنایا جاتا ہے تو اُن لوگوں کو بھی ملزم بنایا جائے جو قتل میں شریک ہیں۔''ملزم

''پہیلیاں مت بجھاؤ، صاف صاف کہو''۔عدالت

''مائی باپ ! آپ کے سامنے عدالت میں جو یہ دو سپاہی کھڑے ہیں اِن سے پوچھا جائے کہ جب راکیش نے شیخ ننھے کا قتل کیا اُس وقت وہاں یہ کیا کر رہے تھے ''۔ملزم

''پہلے تم بیان کرو''۔عدالت

''مائی باپ !راکیش پنچھی نگر کا چارج شیٹیڈ غنڈہ ہے۔غریب شیخ ننھے دنگوں کے زمانے میں اُس دن کچھ دیر کے لیے کرفیو اُٹھنے پر شاید راشن پانی کے لیے نکلا ہی تھا کہ راکیش نے پیچھے سے آکر اُس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔وہ بے چارہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔میں راکیش کو پکڑنے کے لیے اُس کے پیچھے دوڑا تو وہ بھاگتے بھاگتے خون آلودہ خنجر پھینک کر غائب ہو گیا۔آپ کے سامنے حاضر یہ دونوں کانسٹیبل جبر سنگھ اور ظالم سنگھ پاس کی ایک بند دُکان کے پٹیے پر بیٹھے بیڑی دھونک رہے تھے جب میں نے چیخ کر راکیش کو پکڑنے کے لیے کہا تو یہ دوڑے آئے اور اُلٹا مجھ کو گرفتار کر لیا۔خنجر میرے قبضے سے برآمد ہونا بتا دیا گواہ لا کر آپ کے سامنے کھڑے کر دیے۔اگر اِن گواہوں سے پوچھا جائے کہ یہ دونوں جائے واردات پر کیوں موجود تھے تو یہ کہیں گے کہ سامنے کے مندر سے درشن کر کے نکل رہے تھے سو ہم نے ملزم موہن کو خون میں سَنا ہُوا خنجر ہاتھ میں لیے بھاگتے ہوئے اور ان دو سپاہیوں کو اُن کے پیچھے ملزم کو پکڑنے کے لیے دوڑتے دیکھا۔جہاں سے ملزم بھاگا وہاں ایک لاش پڑی تھی جو بعد میں شیخ ننھے کی لاش کی شکل میں شناخت کی گئی۔عدالت میں خنجر بھی موجود ہے جس پر خشک خون کے نشان اب بھی موجود ہیں۔خنجر پر میری انگلیوں کے نشانات کا فنگر ایکسپرٹ کا تصدیق نامہ بھی آپ کے سامنے ہے۔مقتول کے خون آلود کپڑے اور دو معتبر گواہ بھی موجود ہیں خواہ وہ راکیش کے ساتھی ہی کیوں نہ ہوں۔اِن شہادتوں کی موجودگی میں اگر میں اپنی بے گناہی کے بارے میں چیخوں، چلاؤں، قسمیں کھاؤں، آپ کے انصاف کی دہائی دوں تو کیا ہوتا ہے۔مائی

باپ! انصاف کی دیوی اندھی ہے۔ جس کا مطلب میں یہ سمجھتا تھا کہ عدالت کو کچھ نظر نہیں آتا سوائے انصاف کے۔ میں کہتا ہوں عدالت کو نظر آتا ہے۔ عدالت کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ عدالت کی وہ آنکھیں ہیں یہ پولس۔ یہ جیسا عدالت کو دکھاتے ہیں ویسا ہی عدالت دیکھتی ہے۔ آپ کے سامنے پولس نے جائے واردات کا پورا منظر نامہ پیش کر دیا۔ قاتل کو مع آلۂ قتل کے اور مقتول کو پوسٹ مارٹم رپورٹ اور خون میں سنے کپڑوں کی شکل میں پیش کر دیا۔ اب عدالت کو آنکھیں نہ ہوکر بھی سب کچھ نظر آرہا ہے۔ وہ ملزم موہن خنجر چھپائے پنچھی پور کی گلی نمبر تین سے نکلا۔ وہ اُس نے شیخ ننھے کی پیٹھ میں پوری طاقت سے خنجر گھونپ دیا۔ وہ شیخ ننھے زمین پر گرا وہ خون کا فوارہ اُس کی پیٹھ سے نکلا۔ وہ ملزم موہن بھاگا۔ وہ پولس کے دو کانسٹیبلوں نے پیچھا کر کے دبوچ لیا اور خنجر اُس کے ہاتھ سے ضبط کر لیا۔ مائی باپ! آپ کو پولس کی آنکھیں درکار ہیں۔ آپ کا انصاف آپ کے اِنھیں چشم دید گواہوں کے بیان اور ثبوت پر مبنی ہے''۔ ملزم

''لیکن تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ قتل کسی راکیش نام کے شخص نے کیا ہے''۔ عدالت

''مائی باپ ! میں کہہ رہا تھا۔ میرے پاس زبان ہے۔ عدالت کی وہ آنکھیں نہیں جس سے وِیڈیو فلم کی طرح منظر پیش کر سکوں''۔ ملزم

''ہم تمھیں اجازت دیتے ہیں۔ تم راکیش کے خلاف رپٹ لکھواؤ ہم پورے کیس کی ازسرِ نو تحقیقات کا حکم ابھی جاری کرتے ہیں''۔ عدالت

''مائی باپ ۔ میرے رپٹ لکھوانے کا مطلب یہ ہوگا کہ راکیش عدالت کا کام آسان کر دے گا۔ اِس سے پہلے کہ آپ مجھے سزا دیں راکیش مجھے ایسی سزا دے دے گا جو شاید آپ بھی نہ دے سکیں''۔

☆☆☆

۳- رَمن اور حسن

حَسن اور رمن بچپن کے دوست تھے۔ ہائر سیکنڈری تک دونوں نے ساتھ ساتھ پڑھا تھا۔ اُس کے بعد حَسن نے پڑھائی چھوڑ کے پاور لوم کا دھندا اختیار کیا۔ رَمن نے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کر کے خود کی کنسلٹینسی فرم کھول لی۔ اپنے اپنے کام میں انتہائی مصروف ہونے کے باوجود دونوں دوست روز ہی ملنے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکال لیتے تھے۔ ایک دوسرے کے دُکھ سکھ کی خبر رکھتے تھے۔ ہر کام ایک دوسرے کی صلاح مشورے سے کرتے تھے۔

حَسن کا اکلوتا لڑکا مجید جب بڑا ہُوا تو رَمن نے اپنی نگرانی میں اُسے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کرا کے اپنی ہی فرم میں اپنے لڑکے کے ساتھ پارٹنر بنالیا۔ مجید کے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہوجانے کے بعد حسن کی خواہش تھی کہ اُس کی شادی سے نمٹ کے اپنی بیوی کے ساتھ وہ حج کے لیے چلا جائے۔ حَسن نے جب یہ خواہش رمن سے ظاہر کی تو اُس نے بہت خوش ہو کر بڑے اعتماد کے ساتھ کہا ''تم فکر مت کرو، مجید کی شادی اِسی سال ہوگی اور تم دونوں میاں بیوی اِسی سال حج کو جاؤ گے''۔ مجید ایک ایڈوکیٹ لڑکی سے پیار کرتا ہے اور لڑکی بھی اُسے بہت چاہتی ہے، رمن کو معلوم تھا اور یہ بات وہ حسن کو بتانے

کے لیے موقع کی تلاش میں ہی تھا۔ رمن یہ بھی سمجھتا تھا کہ اتنے ہونہار لڑکے کے ساتھ شادی کرنے سے کوئی بھی لڑکی کا باپ کبھی منع نہیں کرے گا۔ اُس نے مجید سے کہا ''ایک بہت اچھی لڑکی میری نگاہ میں ہے۔ بس رشتہ طے ہی سمجھو۔ تم تو شادی کی تیار کرو''۔ دوسرے ہی دن دونوں دوست لڑکی کے گھر والوں سے ملنے کے لیے گئے اور کچھ ہی دنوں کی بات چیت کے بعد منگنی کے ساتھ شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔

مجید کی شادی سے فراغت کے ساتھ ہی حج کے لیے روانگی کی تاریخ بھی آگئی اور حسن اپنے بیٹے بہو کو رمن کی دیکھ ریکھ میں چھوڑ کر بیوی کے ساتھ سعادتِ حج کے لیے روانہ ہوگیا۔

سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن حاجیوں کی واپسی کے زمانے میں شہر میں فرقہ وارانہ دنگے پھوٹ پڑے۔ گودھرا ٹرین حادثے کے بعد دنگائیوں نے ہزاروں کی تعداد میں منظم ہوکر منصوبہ بندی کے ساتھ چُن چُن کر مسلمانون کے گھروں اور دُکانوں کو جلا کر برباد کرنا شروع کردیا۔ اِکا دُکا تنہا مسلمانوں کو قتل کرنے کے ساتھ گھروں میں گھیر کر زندہ جلانے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ عصمت دری کے واقعات بہت عام ہوگئے۔ اِن حالات میں حسن کے بیٹے اور بہو کی جان، مال اور آبرو محفوظ رہ پانا غیر یقینی ہوگئی۔ جب حالات زیادہ بگڑے تو ایک رات رمن اپنی کار لے کر مجید کے پاس پہنچا۔ اُس کے دروازے پر اُس نے جلی حروف میں اوم (ॐ) کا نشان بنایا۔ اُس کے اوپر جے شری رام لکھا اور ایک ہندو نام کی تختی لگادی۔ گھر کے زیورات اور نقدی وغیرہ کے ساتھ مجید اور اُس کی بیوی کو کار میں بٹھا کر اپنے گھر لے آیا اور تیسری منزل پر چھپا دیا۔ گھر کے لوگوں کو سختی سے تاکید کردی کہ کسی بھی باہر کے آدمی

کو مجید کے چھپے ہونے کی بَھنک بھی نہ لگے۔

اُسی دوران سوراشٹر میل سے کچھ حاجیوں کو اُتار کر زندہ جلا دینے کی خبر آئی۔ حاجی حسن کو جلا دیے جانے کی تصدیق ریلوے پولس اور رزرویشن چارٹ سے ہو گئی۔ یہ اطلاع جیسے ہی رمن کو ملی اُس نے پستول اٹھایا اور سیدھا مکان کی تیسری منزل پر پہونچ کر مجید سے روتے ہوئے بولا ''لے یہ پستول، اور مجھے گولیوں سے بھون دے کیونکہ میری قوم اور دھرم کے لوگوں نے تیرے باپ کو زندہ جلا دیا ہے''۔

مجید ذہنی طور پر یہ خبر سُننے کے لیے آمادہ نہیں تھا لیکن جیسے ہی اُسے اپنے باپ کے زندہ جلا دئے جانے کی بات گمان سے یقین کی حد تک پہنچی وہ دوڑ کے رمن سے لپٹ گیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ مجید کی بیوی بھی لپٹ کے رونے لگی۔ مجید اپنی آواز اور جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے بولا ''اَنکل ! آپ کو تو ہمیشہ زندہ رہنا ہے کیونکہ انسانیت کو دُنیا میں زندہ رکھنا ہے''۔

☆☆☆

۴- ناگن

راکیش آج بہت خوش تھا۔ شہر کے ریاست خاں جیسے باعزت اور باوقار شخص کی اکلوتی بہو کی عزت جی بھر کے لوٹنے کو ملی تھی۔ ساتھ ہی اُس کا قیمتی ڈائمنڈ نیک لیس بھی۔ خوش خوش گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی کو گلے لگا کر جیسے ہی نیک لیس پہنانے لگا تو بیوی نے غصے میں پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔

''کسی مرے کا مال ہے تو مجھ سے دور ہی رکھنا مجھے نیک لیس دیک لیس نہیں چاہیے''

راکیش کو معلوم تھا کہ اُس کی بیوی رادھا بہت دیالو دھارمِک وچار کی ہے اگر اُسے صحیح بات بتادوں تو وہ اُسے ہرگز نہیں لے گی۔ راکیش اپنے ضمیر کا قتل تو بہت پہلے کر چکا تھا فوراً پینترا بدلتے ہوئے بولا۔

''مرے کا مال کہاں سے آیا وہ جو مسلمان گھر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں نا، اُن کے زیور ہیں۔ اور وہ بھی میں نہیں میرے ساتھی خالی گھروں سے نکال کے لائے ہیں۔ وہ نہ لاتے تو کوئی اور لے جاتا۔ اُنھیں لوگوں نے یہ نیک لیس مجھے دیا ہے''۔

''رام رام ! کتنے دُشٹ ہو تم لوگ '' رادھا بولی

اِس میں دشٹ ہونے کی کیا بات ہے۔ مسلمانوں کا مال ہے۔ وہ لوگ یہ سب کیا عرب سے لائے ہیں۔ یہ دھن دولت جو اُنھوں نے کمایا ہے ہمارا حق مار کے ہی تو کمایا ہے۔

اِس لیے اُن کا مال متاع ہندوؤں کا ہی تو ہُوا۔ راکیش نے رادھا کو دلیل دیتے ہوئے سمجھایا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی رادھا نے راکیش کا دل رکھنے کے لیے نیک لیس گلے میں ڈال لیا۔

دو تین روز گذر جانے کے بعد ایک رات نیند میں راکیش زور زور سے کچھ بڑبڑانے لگا۔ خوف ووحشت سے اُس کی گھگّی بندھ گئی۔ پورا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ ھوھوھو۔ھوھوھو۔ھو۔ھو۔ رادھا کی نیند کھل گئی۔ اُس نے دیکھا راکیش بُری طرح کانپ رہا تھا اُس نے اُسے رضائی میں دباتے ہوئے پوچھا

''کیا بات ہے''

''بچاؤ۔ وہ لڑکی میرا گلا گھونٹ رہی ہے''۔ بمشکل راکیش بول پایا۔

''مگر یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ تم نے بُرا سپنا دیکھا ہے۔ تھوڑی دیر رام نام جپ کے پورب دِشا میں منھ کر کے سو جاؤ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رادھا نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ راکیش ڈرتے ڈرتے اٹھا۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے گھر میں ہر طرف دیکھا اور پھر پورب دِشا میں منھ کر کے رام نام کی مالا جپتے جپتے اُس کی نیند لگ گئی۔

دو تین دن اور گذر جانے کے بعد ایک رات نیند میں راکیش پھر پچھلی بار کی طرح زور زور سے کچھ بڑبڑانے لگا۔ رادھا کی نیند کھل گئی اُس نے دیکھا وہ بُری طرح کانپ رہا تھا جیسے اُسے بخار چڑھ رہا ہو۔ رادھا اُس پر رضائی ڈالنے کے لیے جیسے ہی جھکی وہ زور سے چیخا۔ ''ناگن ناگن، رادھا تیرے گلے میں ناگن''۔

''ارے یہ تو نیک لیس ہے وہی جو تم لائے تھے مسلمانوں کے گھروں سے چوری کے حصے کا''۔ رادھا نے اُسے پیار سے تسلّی دی۔ لیکن راکیش کی نگاہ تھی کہ نیک لیس سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ خاموش ہو گیا۔ رادھا بھی سو گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر

راکیش کو ایسا لگا جیسے پورے گھر میں کالی ناگنیں رینگ رہی ہیں۔ اندھیرے میں اُن کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ وہ پھر چیخا۔

''ناگن۔ ناگن۔ ناگن۔ نا۔ نا۔ ناگن۔''

رادھا گھبرا کے اُٹھ بیٹھی اُس نے سہمے ہوئے انداز میں جلدی جلدی پورے گھر کی بتیاں روشن کر دیں۔ پورے گھر کا ایک ایک کونا چھان ڈالا مگر کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ بولی

''تم پر کچھ اثر ہو گیا ہے۔ میں سویرے ہی ہرے بابا کے پاس جا کر تعویذ گنڈا لاتی ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

''مگر ہرے بابا کی کٹیا تو بہت دن ہوئے جل گئی''۔ راکیش بولا

''رام۔ رام بہت بُرا ہوا۔ دُشٹوں نے ہرے بابا جیسے سِدھی پراپت مہاپُرش مہاتما کو بھی نہیں چھوڑا۔ اِن کا ستیاناس ہو''۔ رادھا نے کوسا

''رادھا ! بھگوان مجھے چھما کرے بابا کی کٹیا میں آگ میں نے ہی لگائی تھی جب وہ سو رہے تھے۔'' راکیش نے افسوس اور پشیمانی کے لہجے میں کہا۔

''تو کیا بابا بھی جل گئے؟'' رادھا نے پوچھا

''جل ہی گئے ہونگے مگر میں نے نہیں دیکھا''۔ راکیش نے جواب دیا۔

''مہاتماؤں کے ساتھ ایسا دُشٹ بیوہار کرنے والوں کو بھگوان چھما نہیں کرے گا، دیکھو اب کیا ہوتا ہے''۔ رادھا نے گہرے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ راکیش پھر چیخا۔

''ناگن۔ رادھا تیرے گلے میں ناگن''۔ رادھا نے گھبرا کے دونوں ہاتھوں سے گلے کو جھٹک ڈالا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اُس نے نیک لیس اتار کر ایک انگوچھے میں باندھ کر وہیں راکیش کے سرہانے رکھ دیا۔ سہمے سہمے اور خوف کے ماحول میں دونوں کی

نیند لگ گئی۔ سویرے سویرے رادھا حسبِ معمول اُٹھ کر گھر گرہستی کے کام میں لگ گئی۔

راکیش کافی دن چڑھے اُٹھا۔ منھ ہاتھ دھو کر انگوچھے سے منھ پونچھنے آیا تو اُسے ایسا لگا جیسے انگوچھے کے اندر ناگن کلبلا رہی ہو۔ وہ پھر چیخا۔ ''ناگن۔ ناگن''۔

رادھا ''کہاں کہاں'' کہتی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی۔ راکیش نے انگوچھے کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ بھی تو نہیں''۔ کہہ کے انگوچھا کھول کر نیک لیس دکھاتے ہوئے رادھا نے کہا۔

راکیش بولا

''رادھا میری بات سُن۔ تو اس منحوس نیک لیس کو ابھی جس قیمت پر بھی بکتا ہو، بیچ آ۔ اور جو پیسے ملیں اُس سے ہرے بابا کی کٹیا دوبارہ بنوا دینا اور اُس میں اُن کا مزار بھی''۔

رادھا نے انگوچھا اٹھایا اور تھوڑی دور پر ہی ایک جوہری کی دُکان پر لے گئی۔ جوہری نے نیک لیس دیکھتے ہی اُسے ڈانٹا۔

''بُلاؤں پولس کو۔ سویرے سویرے ٹھگنے آ گئی نقلی ہار لے کر''۔

رادھا سہم گئی۔ الٹے پیر بھاگی۔ غصے میں نیک لیس کو نالی میں پھینک دیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی رادھا نے دیکھا راکیش کو لہریں آ رہی تھیں۔ زہر پورے جسم میں پھیل چکا تھا۔ ناگن اُسے ڈس چکی تھی۔

☆☆☆

۵-آگ

کریم زلیخا سے پیار کرتا تھا۔ بڑے جتن کے بعد اُس نے اپنے ماں باپ کو اُس سے شادی کے لیے تیار کیا تھا۔ زلیخا کے گھر والوں نے بھی کئی عزیزوں کے اصرار اور سمجھانے پر کریم کا رشتہ منظور کیا تھا اور خدا خدا کر کے ۱۰ر مارچ شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ شادی کی تیاری چل رہی تھی کہ کریم کی والدہ کی دل کی بیماری نے شدت اختیار کر لی اور ڈاکٹروں نے بمبئی لے جا کر ہارٹ سرجری کی صلاح دی۔ کریم کے والد پہلے ہی فالج کے عارضے سے معذور تھے۔ گھر میں اور کوئی خاندان کا فرد نہیں تھا۔ مجبوری میں کریم اپنے باپ کو نوکر اور پڑوسیوں کے بھروسے چھوڑ کر بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ شادی میں ایک مہینے کا وقت تھا اس لیے کریم کو یقین تھا کہ وہ شادی سے پہلے ماں کو واپس لے کر آ جائے گا۔ اُس نے روانگی سے پہلے زلیخا کو فون پر تسلی دی کہ ''میں جلد سے جلد ماں کا علاج کرا کے واپس آ جاؤں گا۔ تم فکر مت کرنا۔ شادی سے پہلے ویسے بھی ہم مل نہیں سکتے اِس لیے دس مارچ تک دُعا کے ساتھ انتظار کرو''۔

بمبئی کے ہندوجا ہسپتال میں آپریشن کے بعد صحت مند ہو کر جس دن کریم کی ماں ڈسچارج ہونے والی تھی اُسی دن گجرات فرقہ وارانہ دنگوں کے شعلوں سے جل اُٹھا۔ گجرات کے حالات سے وہ بہت فکرمند تھا اور گھر لوٹنے کے لیے بے چین۔ احمد آباد میں تمام عزیزوں دوستوں کے ٹیلیفون ٹھپ تھے۔ اور کوئی خبر نہیں مل پا رہی تھی۔ ماں کے ڈسچارج ہوتے ہی پہلی ٹرین پکڑ کر وہ احمد آباد پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی اُس نے لوگوں سے شہر کا حال دریافت کیا۔ عزیزوں، دوستوں اور زلیخا کے فون گھمائے لیکن کہیں بھی گھنٹی بجنے کے باوجود کسی سے بات چیت نہیں ہوئی۔ دن کا کرفیو اُٹھا ہوا تھا اُس نے ماں کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر خود گھر جا کر وہاں کی خیر خبر لینے کے بعد ماں کو بعد میں

گھر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ماں کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر وہ اسٹیشن کے باہر آٹو رکشا اسٹینڈ پر آیا اور قطار میں کھڑے پہلے رکشہ میں بیٹھنے لگا تو رکشہ والے نے اُس کی ڈاڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بٹھانے سے منع کر دیا۔ دوسرے رکشہ کی طرف بڑھا تو اُس نے دور سے ہی ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ رکشہ والوں کے اِس سلوک سے وہ خوف زدہ ہو گیا اُسے اپنی جان کے لیے خطرہ نظر آنے لگا۔ اُس کا سر چکرانے لگا اور ایسا لگا جیسے سب رکشہ والے اُس سے کہہ رہے ہوں کہ میاں جی جان کی امان چاہتے ہو تو چہرے سے یہ اسلامی ٹریڈ مارک نکال پھینکو۔ وہ پلٹ رہا تھا کہ ایک رکشہ والے نے اُسے روک کر ہمدردی سے کہا میاں جی یہ ڈاڑھی صاف کرا دو ورنہ پریشانی میں پڑ جاؤ گے۔ کوئی رکشہ والا نہیں بٹھائے گا یہ رکشہ یونین کا حکم ہے۔ وہ پلٹا اور سیدھا اسٹیشن کے باہر ایک دکان پر جا کر شیونگ کا سامان خریدا اور ویٹنگ روم میں آ کر ڈاڑھی مونچھ صاف کر کے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ جس بلڈنگ میں اُس کا فلیٹ تھا وہاں کے ہندو باشندے دنگوں کی توڑ پھوڑ سے غیر متاثر تھے۔ وہ جیسے ہی بلڈنگ میں داخل ہُوا وہاں موجود ہندو عورتیں آنکھ پھاڑ پھاڑ کر کریم کو دیکھنے لگیں۔ سب کی زبانیں بند تھیں لیکن آنکھوں کے اشارے حیرت سے کہہ رہے تھے کہ یہ ابھی تک زندہ ہے۔ وہ سیدھا اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر اُسے ایک عورت ملی جو شرافت اور خدمتِ انسانی کے لیے بہت مشہور تھی اور لوگ اُسے پیار میں امرت بین کہتے تھے۔ امرت بین نے دیکھتے ہی کریم کو گلے سے لگا لیا اور پوچھا بیٹا تیری ماں کہاں ہے۔ کریم نے روتے ہوئے پوچھا ''چاچی میرے ابو کہاں ہیں''۔ امرت بین نے بتایا ''بیٹا یہاں بجرنگ دل والوں نے ایک دن حملہ کر دیا۔ جتنے تم لوگوں کے فلیٹ تھے اُن میں توڑ پھوڑ کی۔ سامان اوپر سے نیچے پھینکا اور اکٹھا کر کے جلا دیا۔ لوگوں کو مارا پیٹا اور فلیٹوں سے نکال کر بھگا دیا۔ سُنا ہے وہ لوگ راحت کیمپوں میں ہیں لیکن کس کیمپ میں ہیں یہ مجھے بھی نہیں معلوم''۔ کریم اپنے فلیٹ کی طرف بڑھا۔ اُس نے دیکھا دروازہ ٹوٹا ہُوا الگ پڑا تھا۔ گھر اور بکھرا ہُوا سامان شکستگی

کی حالت میں خود پر حملے اور تباہی کی داستان بے زبان ہو کر بھی چیخ چیخ کر سنا رہا تھا۔
کریم فلیٹ کا منظر دروازے سے ہی دیکھ کر لوٹ آیا اور سیدھے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ سوچ رہا تھا کیا یہ میرا دیس ہے۔؟ کیا یہ میرا شہر ہے؟ کیا میں یہیں پیدا ہُوا ہوں؟ کیا یہیں میری منگیتر اور دوست احباب رہتے ہیں؟ کہاں ہیں وہ سیکولر ہندو؟ کہاں ہیں وہ میرے ہندو جگری دوست؟ کہاں ہے حکومت اور انتظامیہ؟ کون دے میرے اِن سوالوں کا جواب۔ جن کے پاس جواب ہیں وہ سوال سُن نہیں سکتے۔ اُن کے کان بہرے ہیں۔ جو بہرے نہیں وہ اندھے ہیں۔ جو بہرے بھی نہیں اور اندھے بھی نہیں وہ مُردہ ضمیر ہیں وطن فروش اور وطن شکن ہیں۔ لیکن مجھے زمین سے بھی محبت ہے اور زندگی سے بھی اِس لیے اِن اندھے بہروں کے ساتھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ خدا کرے کوئی ایسا محبت کا کلینک کُھلے جہاں اِن کے کان آنکھ کھل جائیں۔ اِسی سوچ میں گم وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ کریم کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی ماں کو لے کر کسی راحت کیمپ میں بھرتی ہو جائے اور پھر اپنے ابو اور زلیخا کو تلاش کرے۔

ویٹنگ روم سے اپنی ماں کو لے کر وہ اپنے محلے کے پاس والے راحت کیمپ پہنچ گیا۔ وہاں کے منتظمین کو پورا ماجرا سُنا کر اپنا اور اپنی ماں کا نام رجسٹر کرایا۔ اُسے ایسا کمرہ الاٹ ہُوا جس میں سات لوگ پہلے سے ہی پناہ گزیں تھے۔ تِل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ مگر حالات کے جبر کے سامنے بے بس تھا۔ عجیب مجبوریاں تھیں زندگی آدمی کو مرنے نہیں دے رہی تھی اور لوگوں کے بے موت مرنے سے بھی زندگی کا مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا تھا۔ کریم کا خیال تھا کہ اُس کے ابو کو اِسی کیمپ میں ہونا چاہیے۔ اِس لیے اُس نے سامان رکھنے کے بعد سب سے پہلے کیمپ کے رجسٹر میں اُن کا نام تلاش کیا وہاں نہ ملنے پر اُس نے ایک ایک سے پوچھا۔ کچھ پتا نہ چلنے پر وہ پاگل کی طرح کیمپ کے ایک ایک کمرے میں جھانکتا پھرا۔ آخر مایوس ہو کر اپنے کمرے میں آ کر بیمار ماں کے سینے سے لگ کر کہنے لگا۔

”ماں عبرت کا مقام ہے کہ بینک میں ہمارے لاکھوں روپے اور لاکر میں بھی

لاکھوں کے جواہرات ہوتے ہوئے بھی خدا نے ہمیں اِس راحت کیمپ نُما محتاج خانے میں فقیروں کی زندگی جینے پر مجبور کردیا ہے۔ نہ ہم اپنے گھر جاسکتے ہیں نہ دوسرا گھر خرید سکتے ہیں۔ نہ ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔ ہر جگہ موت بے گناہوں کے پیچھے ننگی تلوار لے کر دوڑ رہی ہے''۔

دوسرے دن کئی راحت خانوں میں اپنے ابّو کو تلاش کرنے کے بعد بھی جب کریم کو مایوسی ہی ہاتھ لگی تو متعلقہ تھانے پہنچ کر اُس نے ڈیوٹی پر تعینات ہیڈ کانسٹبل کو پورا ماجرا سُنا کر مدد کی درخواست کی۔ ہیڈ کانسٹبل نے کریم کے سامنے ایک ''فوت[1] رجسٹر'' اور ایک ''فرار[2] رجسٹر'' رکھتے ہوئے اُس میں تلاش کرنے کو کہا۔ فوت رجسٹر دیکھنے کے بعد کریم نے کہا ''اِس میں تو اُن کا نام نہیں ہے''۔ ''تو یہ فرار رجسٹر دیکھ لو'' ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔ ''مگر وہ تو بوڑھے اور فالج زدہ ہیں، چل پھر نہیں سکتے تو فرار کیسے ہوجائیں گے''۔ کریم نے جھلّا کر کہا۔

''ایسا کرو'' ''گواہ لا کے اُن کا نام جل کر مرنے والوں میں لکھوا دو۔ ہم فوتی (ڈیتھ سرٹیفکیٹ) تصدیق نامہ دیدیں گے تم کو ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا'' ہیڈ کانسٹبل نے بڑے رازدارانہ انداز میں مشورہ دیا۔ ''ہیڈ صاحب ! مجھے پیسہ نہیں، اپنے پِتا کا پتا چاہیے''۔ کہتا ہوا کریم تھانے سے نکل آیا اور زلیخا کی تلاش میں لگ گیا۔ کئی کیمپوں میں بھٹکنے کے بعد ایک کیمپ کے طہارت خانے (TOILET) کی قطار میں زلیخا نظر آئی۔ وہ لڑکی جس کی پرورش ایر کنڈیشنڈ مکان میں ہوئی ہو وہ چلچلاتی دھوپ میں لوٹا لیے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ کریم اُس کی طرف لپکا۔ وہ کریم کو دیکھتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

۱- Register of dead persons
۲- Register of Missing persons

۶- جے شری رام

نورنگ پور پچیس تیس ہزار کی آبادی کا تاریخی قصبہ تھا جسے کسی مغل بادشاہ نے آباد کیا تھا۔ وہاں اُس زمانے کا شاہی قلعہ، جامع مسجد، تالاب، باوڑیاں اور مقبرے وغیرہ آج بھی اچھی حالت میں موجود تھے۔ یہ شہر اگرچہ مسلمان بادشاہوں کا بسایا ہُوا تھا لیکن مسجدوں، مقبروں اور خانقاہوں کی تعداد کے لحاظ سے مسلمان کم تعداد میں تھے اِس لیے کچھ مسجدیں غیر آباد بھی تھیں۔ اِس شہر کی اہم خوبی ہندو مسلم بھائی چارا اور گنگا جمنی تہذیب تھی۔ فرقہ پرستوں نے اِس شہر کی فضا مکدر کرنے کی اکثر کوشش کی لیکن یہاں کی زمین میں فرقہ وارانہ نفرت کے بیج سے انکُر نہیں پھوٹتا تھا۔ ملک کی تقسیم کے وقت یا بابری مسجد کے انہدام کے وقت بھی یہاں امن اور سکون قائم رہا لیکن گذشتہ کچھ سال سے دوسرے شہروں سے آنے والے دھرم پرچارکوں نے مسلمانوں کو حملہ آور، بدیسی مذہب ماننے والے اور ایک ہزار تک ہندوؤں کا استحصال کرنے والی قوم کا لگاتار پرچار کر کے یہاں کی زمین میں وہ کھاد ڈال دیا تھا جو نفرت کے پودوں کی نشو و نما کے لیے سازگار تھا۔ آر۔ ایس۔ ایس کی شاکھا بھی لگنے لگی تھی جس میں اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگایا جاتا تھا۔ ہندو تیوہاروں پر شہر کو بھگوا جھنڈے، جھنڈیوں اور بینرس (BANNERS) سے بھگوا رنگ میں ڈبو دیا جاتا تھا جلوس بھی نکالے جاتے تھے جس میں قابلِ اعتراض نعرے لگائے جاتے تھے۔ گئو رکشا سمیتی کا دفتر بھی کھل گیا تھا جب کہ یہاں نہ گائے ذبح ہوتی تھی نہ گایوں کی پرورش یا تحفظ کا کوئی مسئلہ تھا۔ ہندو جاگرن منچ اور ہندو مہا سبھا نے یہاں کی مسجدوں

اور مقبروں کو غلامی کی علامت قرار دے دیا تھا۔ دھیرے دھیرے فرقہ وارانہ کشیدگی، تعصُّب اور نارواداری نے اپنی جڑیں جمالی تھیں اور ہزار سالہ غلامی کی علامات مٹانے کے لیے کسی شُبھ اَوسر کا انتظار تھا۔

میاں نذیر شہر کے بااثر اور متمول آدمی تھے۔ ایم ایل اے رہ چکے تھے۔ اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ اُن کا لڑکا بشیر اور لڑکی کنیز کالج میں پڑھتے تھے۔ کنیز بہت خوب صورت تھی۔ سروقد، دراز گیسو، گلاب کے تازہ پھول کی طرح مہکتا دہکتا چہرہ۔ اُس کے کالج جانے کے وقت محلّے کے لڑکے اُسے دیکھنے کے لیے گلی کے نکڑ پر کھڑے رہتے تھے۔ کچھ سفلہ خصلت لڑکے بھی کھڑے ہوکر آوازیں کستے تھے مگر اُس کے بھائی بشیر اور اُس کے ساتھیوں کا اتنا رعب تھا کہ کنیز کو ترچھی نظر سے دیکھنے اور دل میں آہیں بھرنے سے آگے بڑھنے کی کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

شہر کے ایک رئیس نٹور لال کی لڑکی مدھوکانتا کالج میں بشیر کی کلاس میٹ تھی۔ دونوں ڈرامہ کرنے کے شوقین تھے۔ کالج میں اِن دونوں کی شرکت کے بغیر کسی ڈرامے کے انعقاد کا تصور نہیں تھا۔ کلاس اور ڈرامے میں قربت سے دونوں کے دل کیوپڈ کے تیر کا شکار ہو گئے تھے۔ دونوں کا جسمانی رشتہ قائم ہو جانے کی وجہ سے شادی کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ دونوں کو یقین تھا کہ اُن کے ماں باپ انٹر کاسٹ شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ آخر ایک روز دونوں رات کے اندھیرے میں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر زندگی کی نئی منزلیں تلاش کرنے کے لیے انجان راستوں پر چل پڑے۔ دوسرے دن ہی یہ خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پورا شہر فرقہ وارانہ کشیدگی میں ڈوب گیا۔ فرقہ پرست عناصر میاں نذیر کے مکان پر حملے کا خفیہ پلان بنا ہی رہے تھے کہ گودھرا ٹرین حادثہ ہو گیا اور ہندو سنگھٹنوں نے ہر مسلمان کو ISI کا ایجنٹ اور آتنک وادی ہونے کا دھرم پرمان پتر دے دیا۔ میاں نذیر جس کالونی میں رہتے تھے اُس میں داخل ہوتے ہی تین چار مکانوں کے بعد اُن کا مکان تھا۔ راشٹریہ ایکشن فورس کے ایکشن پلان کے

مطابق مکانوں میں ہتھیاروں سے لیس داخل ہوکر پہلے نقدی اور زیورات لوٹنا، اُس کے بعد جو عورتیں لڑکیاں بلاتکار کے لائق ہوں اُن کے ساتھ سب کے سامنے بلاتکار کرنا اور گھر کے تمام افراد کو گھر میں ہی روک کے رکھنا تھا۔ لوٹ اور بلاتکار کے بعد گھر کے سب لوگوں کو زندہ جلانے کا بھی نردیش تھا۔ ان سب کارروائیوں کے بعد گھروں کو پٹرول چھڑک کر یا اور کسی سائنٹیفک طریقہ سے نذرِ آتش کرنے کا نردیش بھی تھا۔

ایکشن فورس جیسے ہی کالونی میں داخل ہوکر پہلے مکان پر حملہ آور ہُوا میاں نذیر ہوشیار ہوگئے۔ اُنھوں نے پولس کے کئی اعلیٰ افسران سے جن سے اُن کے ذاتی تعلقات بھی تھے، بچاؤ کے لیے ٹیلیفون پر فریاد کی مگر سب نے پولس فورس کی کمی کا بہانہ بتا کر مدد پہنچانے میں ٹال مٹول کی۔ اُنھوں نے اور بھی کئی بڑے سول افسروں اور وزیروں سے بھی رابطہ قائم کیا مگر کہیں سے کوئی مدد نہیں پہنچ سکی۔ وہ بے چارے گھبراہٹ میں اپنی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی کوشش میں اِدھر اُدھر ٹیلیفون گھما ہی رہے تھے کہ ایکشن فورس نے اُن کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ مسز نذیر معمر خاتون تھیں اُن کے ساتھ بلاتکار بے مزہ تھا، اُنھیں چھوڑ دیا۔ کنیز تو محلّے کی غیر سماجی لوگوں کی ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر تھی۔ سب سے آسان اور سب سے اچھا شکار تو وہی تھی۔ ایکشن فورس میں 50-60 کارندے تھے جس میں محلّے کے بھی وہ چار غنڈے لڑکے بھی شامل تھے جو کنیز کو کالج جاتے آتے میں چھیڑا کرتے تھے۔ اِن چاروں نے میاں نذیر، اُن کی فیملی اور قیمتی زیورات پر اپنا حق جتاتے ہوئے ایکشن فورس کے باقی کارندوں کو دوسرے علاقے میں آپریشن کے لیے جانے کو کہا۔ تھوڑی دیر اِن لوگوں میں کھُسر پھُسر ہوئی اور سیل فون پر کسی سے بات بھی ہوئی۔ اِس کے بعد میاں نذیر کے مکان کا آپریشن محلّے کے اِن چار غنڈوں کے حوالے کر کے فورس کے باقی لوگ کسی دوسرے آپریشن کے لیے روانہ ہو گئے۔

محلّے کے اِن چار غنڈوں نے میاں نذیر، اُن کی بیگم اور اُن کی لڑکی کنیز کے

ساتھ مار پیٹ کر کے تینوں کو ننگا کر دیا اور باکس ٹائپ لکڑی کے دیوان میں مسٹر اور مسز نذیر کو اَدھ مرا کر کے اِس طرح لٹا دیا جس طرح تابوت میں لاش رکھی جاتی ہے اور اُن سے کہا ''انکل آنٹی ! آپ دونوں اندر ہی مون کرو ہم لوگ آپ کی کنیز کے ساتھ ہی مون کرے گا''۔ باکس دیوان بند کر کے اُس پر گدا ڈال دیا اور اُس پر باری باری سے کنیز کے ساتھ بے خوف ہو کر بلاتکار شروع کیا۔ شروع شروع میں وہ خوب روئی ،چیخی، چلائی مگر دیواریں بہری ہو گئی تھیں جب کہ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اُس کی چیخیں کسی نے بھی نہیں سُنیں، شاید فضا جس کے دوش پر آواز سفر کرتی ہے بے حس ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے کنیز کا رونا بند ہُو گیا، پھر چیخیں بند ہو گئیں اور پھر آواز بھی بند ہو گئی۔ کسی دم توڑتے ہوئے بیمار کی طرح دھیمی دھیمی آوازیں آہیں اور کراہیں رہ گئیں۔ چاروں شراب پی پی کے اور فرِج میں رکھی کھانے پینے کی چیزیں کھا کھا کے باری باری سے قریب چوبیس گھنٹے اطمینان سے بلاتکار کرتے رہے۔ آخر میں ایک غنڈہ جب بلاتکار کے لیے گیا تو زور سے قہقہہ مار کے بولا ''دیکھنا یار یہ ہلتی ہی نہیں ہے۔ سُو سُو بھی نہیں کر رہی''۔ دوسرے نے ٹٹول کر کہا ''لگتی ہے مر گئی سالی''۔ تیسرا بولا ''ظالم بڑی چیٹ پٹی تھی بڑی مزے دار''۔ چوتھا بولا ''چلو اچھا ہُوا خود ہی مر گئی۔ اَپن کو ہتیا نہیں لگی''۔ پھر ایک بولا ''چلو یہاں کا آپریشن تو سپھلتا کے ساتھ پورا ہوا۔ اب سَماپن کیا جائے''۔ یہ کہہ کر اِن لوگوں نے دیوان پر پیٹرول چھڑک کے آگ لگا دی اور تیزی کے ساتھ باہر نکل کر مکان کو بھی آگ لگا دی۔ پھر سب نے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔

''جے شری رام''

☆☆☆

۷-ایثار

اُودے پور میں اسٹیٹ بینک کے برانچ منیجر نوید احمد نے اپنے دونوں لڑکے سلیم اور کلیم کی شادی احمد آباد گجرات میں اپنی سالی کی دونوں لڑکیوں رخسانہ اور عرفانہ سے طے کر رکھی تھیں۔ شادی کے لیے انتظار صرف اِس بات کا تھا کہ دونوں لڑکے پڑھائی پوری کر کے کچھ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ دونوں لڑکوں نے جے پور سے بی۔ایس۔سی کمپیوٹر سائنس کر کے اُودے پور میں اپنا خود کا مشترکہ کمپیوٹر سینٹر قائم کر لیا تھا۔

شادی کی تاریخ ۴ر مارچ ۲۰۰۲ طے پائی تھی اور پروگرام یہ تھا کہ بارات اودے پور سے رات میں بس سے روانہ ہو کر ۴ر مارچ کی صبح احمد آباد پہنچے گی اور دن ہی میں نکاح وغیرہ سے فارغ ہو کر شام کو اودے پور کے لیے واپس روانہ ہو جائے گی۔

۲۸ر فروری کو دونوں طرف مہندی اور اُبٹن کی رسم کے ساتھ گھروں میں شادی کا ماحول گرم ہو گیا تھا۔ مہمانوں کی آمد کے ساتھ، گانا آتا ہو یا نہ آتا ہو، لڑکیوں نے ڈھولک اور اپنی میٹھی آواز سے ماحول کو خوشگوار اور رنگین بنا دیا تھا۔ ہنسی خوشی کے اِس ماحول میں ایک مارچ کو ٹی۔وی سے خبر ملی کہ گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس کی ایک بوگی جس میں رام سیوک اجودھیا سے واپس آرہے تھے، مُسلم شدت پسندوں نے نذرِ آتش کر دی جس میں پچاس ساٹھ رام سیوک زندہ جل گئے۔ مسلمانوں کے اِس جان لیوا حملے کا انتقام لینے کے لیے ہندو انتہا پسندوں نے احمد آباد کے علاوہ گجرات کے کئی شہروں میں

مسلمانوں کی جان، مال، عزت اور آبرو کی کھلم کھلا لوٹ مچا رکھی ہے۔

نوید احمد نے فوراً فون لگا کر اپنی سالی کے شوہر مظفر علی سے خیریت دریافت کی۔ اُنھوں نے بتایا کہ پورے احمد آباد شہر میں غیر میعادی کرفیو نافذ ہونے کے باوجود دنگائی بے خوف شہر میں گھوم رہے ہیں اور بلا روک ٹوک مسلمانون کی دُکانوں، مکانوں اور جائیدادوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ یہ لوگ سیکڑوں کی تعداد میں اکٹھا ہو کر مکانوں پر حملہ بولتے ہیں۔ گھر میں گھُس کر قیمتی سامان لوٹتے ہیں باقی اسباب باہر پھینک کر جلا دیتے ہیں۔ جوان لڑکیوں اور عورتوں کو پکڑ پکڑ کر اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں، بلاتکار کرنے کے بعد زندہ جلا دیتے ہیں یا بھگا دیتے ہیں۔ دنگائیوں کے اِن اچانک اور غیر متوقع حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان نہ ذہنی طور پر تیار تھے نہ جسمانی طور پر۔ گھروں میں ہتھیار تو دُور ڈنڈے لاٹھی تک نہیں تھے جبکہ حملہ آور تلوار، ترشول، چھرے اور کوئی کوئی روالور تک سے لیس تھے۔ مظفر علی نے یہ بھی بتایا کہ اِن یک طرفہ حملہ نما دنگوں کی شدت اور پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ ۴/مارچ تک آگ بجھ جائے گی اور شادی کے لائق شہر ٹھنڈا ہو کے حالات نارمل ہو جائیں گے۔ ۲/مارچ کو بھی فون پر گئی بار بات چیت ہوئی۔ نوید احمد نے مظفر علی سے مذاق میں کہا کہ آج کل اُلٹی گنگا بہانے کا زمانہ ہے۔ حالانہ نہ سدھریں تو دُلھنوں کو دولھا کی طرح سجا کر آپ بارات لے کر آ جانا۔

شادی کے لحاظ سے ۳/مارچ بہت اہم تاریخ تھی۔ سوال یہ تھا کہ حسب پروگرام نوید احمد بارات لے کر احمد آباد جائیں یا مظفر علی لڑکیوں اور سب عزیزوں کو لے کر اُودے پور آئیں۔ دنگے اور کرفیو کے چلتے ہوئے یہ بھی ممکن نہ ہو تو شادی کی تاریخ بڑھادی جائے۔ تمام صورتوں پر غور اور صلاح مشورے کے بعد نوید احمد نے مظفر علی

کوفون لگایا۔ مظفرعلی کے فون پر S.T.D کی سہولت نہیں تھی اور دنگوں کی وجہ سے P.C.O بند تھے اِس لیے حسب معمول نوید احمد نے ہی فون لگایا۔ گھنٹی بجتی تھی مگر کوئی فون (رسیور) نہیں اٹھاتا تھا۔ فون لگانے کا یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہا لیکن مظفرعلی اور اُن کے گھر کے افراد تھے ہی نہیں تو فون کون اٹھاتا۔

ٹیلیفون پر بات نہ ہو پانے کی وجہ سے نوید احمد کے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ شادی کے گھر میں خوشی کی جگہ ماتم کے سیاہ سائے لہرانے لگے۔ احمد آباد میں کچھ اور عزیز بھی تھے وہاں بھی کسی نے فون نہیں اُٹھایا۔ اِس لیے گھبراہٹ اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ تین کے بعد چار مارچ بھی اِسی طرح فکر کے ساتھ رنج وغم میں گذر گئی۔ لڑکوں کی ماں کا رو رو کے بُرا حال ہوگیا۔ عزیز واقارب جو شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے وہ بھی انتہائی فکرمند اور پریشان تھے۔ آخر کلیم اور سلیم نے اپنی خالہ اور خالو کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خود احمد آباد جانے کی اجازت اپنی امّی اور ابو سے مانگی۔ نوید احمد اور اُن کی اہلیہ اگرچہ اِن حالات میں دونوں بیٹوں کو احمد آباد جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے لیکن گھٹنوں میں گٹھیا کے درد کی وجہ سے دوڑ دھوپ کرنے کے لائق نوید احمد نہیں تھے اِس لیے بچوں کی ضد پر بدلِ ناخواستہ تیار ہو گئے۔ سلیم اور کلیم رات کی ٹرین سے روانہ ہوکر ۵ر مارچ کو صبح احمد آباد پہنچ گئے۔ وہاں کرفیو لگا ہُوا تھا اور ریلوے پولس کرفیو پاس جاری نہیں کر رہی تھی۔ دونوں دوسرے دن صبح تک احمد آباد اسٹیشن پر بیٹھے رہے۔ احمد آباد میں کسی عزیز سے فون پر رابطہ قائم نہیں ہوسکا۔ وقفہ وقفہ سے وہ موبائل فون سے اپنے ابّو اور امّی سے بات کر کے اُنھیں تسلّی دیتے رہے۔ ۶ر مارچ کی صبح ۸ر گھنٹے کے لیے کرفیو اُٹھنے کا جیسے ہی اعلان ہُوا، دونوں بھائی خالہ کے گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن کے قریب ہی ایک گلی تھی جس میں دونوں طرف کھانے کے ہوٹل تھے، دن بھر کباب سکنے کی خوشبو اڑتی تھی، اس گلی میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور انسانی

بدن جلنے جیسی چراند اڑ رہی تھی۔ دونوں بھائی گھبراہٹ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر چل کر اُنھوں نے کئی جگہ کجلاتے ہوئے انگاروں کے ڈھیر دیکھے۔ ایسا لگا جیسے ہولی جل کر ابھی ٹھنڈی ہو رہی ہو۔ تھوڑا اور آگے ایک دائرہ نما چال تھی جس میں خالہ کا مکان تھا۔ اِس چال میں پندرہ بیس خاندان رہتے تھے۔ چال کے احاطے میں گھُستے ہی سناٹوں نے خیر مقدم کیا۔ جس چال کی میدان میں بچے ہر وقت شور وغل کرتے رہتے تھے۔ عورتیں چھوٹی چھوٹی پلنگڑیوں پر بیٹھی غپ شپ کرتی رہتی تھیں وہاں ہیبت ناک سناٹا تھا۔ کئی جگہ راکھ کے ڈھیر تھے جیسے کچھ جلایا گیا ہو۔ دونوں بھائی سہمے سہمے خالہ کے گھر کی طرف دبے پاؤں بڑھ گئے۔ دور سے دروازہ بند نظر آیا لیکن قریب جا کر دھکا دیا تو کھُل گیا صرف بھیڑا ہوا تھا۔ اندر دیکھا تو سامان بکھرا ہوا تھا۔ ٹیلیفون کا رسیور ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ ٹوٹی چوڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ گھر کی ہر چیز خود پر ہوئے ظلم وستم کی داستاں بیان کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خوف ودہشت نے کمرے کے درودیوار میں چیخوں کو قید کر دیا ہو۔ ایسا لگا جیسے کوئی دبے پاؤں اُن کی طرف بڑھ رہا ہو۔ کوئی بد روح گلا گھوٹنے کے لیے پنجے پھیلا رہی ہو۔ وہ فوراً باہر نکل آئے اور ریلیف کیمپ کی تلاش میں چل دیے۔ گشت کرتے ہوئے پولس والوں سے پوچھ تاچھ کرتے ہوئے وہ ریلیف کیمپ پر پہنچ گئے۔ معلوماتی کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر نظر دوڑا ہی رہے تھے کہ خالو نظر آ گئے۔ دونوں بھائی دوڑ کر اُن کے گلے سے لپٹ کر زار وقطار رونے لگے۔ خالو اُنھیں اپنے کمرے پر لے گئے جہاں خالہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت زمین پر لیٹی تھیں۔ اپنے بھانجوں کو دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ خالہ اِس بربریت اور حیوانیت کے ننگے ناچ کی چشم دید گواہ تھیں۔ اپنی دونوں لڑکیوں اور چال کی کئی عورتوں پر انسان نما شیطانوں کے ظلم کی داستان کو اُنھوں نے اپنے جسم میں قید کر رکھا تھا۔ وہ سراپا مظلومیت کا مجسمہ بنی ہوئی زمین پر بیٹھی تھیں۔ سلیم اور کلیم کو اِس طرح دیکھ رہی تھیں

جیسے پہچانتی ہی نہ ہوں۔ دونوں کو سامنے پا کر نہ اُنھیں خوشی ہوئی نہ حیرت۔ ہونٹ برف کی طرح منجمد ہو گئے تھے اُن میں ارتعاش بھی نہیں تھا۔ مظلومیت نے آنسوؤں کو آنکھوں کے اندر ہی کہیں قید کر دیا تھا۔ بہت دیر کی خموشی کے بعد خالو نے اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ بلاتکار اور اُس کے بعد زندہ جلا دینے کا واقعہ اِس طرح نپے تُلے الفاظ میں بیان کیا جیسے یہ کوئی خاص واقعہ نہ ہو بلکہ عام واقعہ ہو۔ بات ختم کر کے خالو خاموش ہو گئے۔ خالہ کے ہونٹوں پر لگے تالوں کی تو جیسے کنجی ہی کھو گئی تھی۔ اُسی کمرے میں خالہ کے پاس ہی دو اور لڑکیاں غم واندوہ کا پیکر بنی ہوئی بیٹھی تھیں۔ خالو نے سکوت توڑتے ہوئے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اِن کی عصمت اور آبرو بچاتے ہوئے اِن کے ماں باپ شہید ہو گئے پھر بھی یہ بلاتکار کا شکار ہو گئیں۔ ان کا اب کوئی سہارا نہیں۔ اِنھیں کون رکھے گا۔ کون ان کی شادی کرے گا اور اِن سے کون شادی کرے گا۔ ہماری بیٹیاں ہماری جان بچانے کی کوشش میں دنگائیوں کے غیظ وغضب کا شکار ہوئیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھنے کے بعد ابھی تک زندہ ہیں بیٹا۔ موت بھی نہیں آتی''۔ مظفر علی رونے لگے۔ ''ہم آپ کو اور خالہ جان کو اُودے پور لے جانے کے لیے آئے ہیں''۔ کلیم سلیم نے کہا۔ ''چلیں گے بیٹا چلیں گے۔ اب یہاں بچا ہی کیا ہے لیکن تمہاری خالہ کو اب اِن لڑکیوں میں رخسانہ اور عرفانہ نظر آنے لگی ہیں، اِن کا کیا ہوگا''۔ مظفر علی نے فکر مند لہجے میں کہا۔

''خالو میاں ! آپ اِن کی فکر نہ کریں، ہم آپ کے ساتھ انھیں بھی لے چلیں گے۔ ہم دونوں بھائی اِن دونوں لڑکیوں سے شادی کریں گے''۔ سلیم کلیم نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

☆☆☆

۸- کچے دھاگے کی طاقت

شہر کے بیچ گورا گنج میں واقع فلاور بلڈنگ میں کُل بارہ فلیٹ تھے جس میں فلیٹ نمبر آٹھ کو چھوڑ کر باقی سب میں ہندو رہتے تھے۔ فلیٹ نمبر آٹھ میں مجید بھائی رہتے تھے جن کا بڑا ٹرانسپورٹ بزنیس تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی مجید بھائی نے خود کو کبھی غیر محفوظ محسوس نہیں کیا تھا۔ اُن کے دفتر میں اکثر ہندو کام کرتے تھے۔ ڈرائیور کلینر بھی زیادہ تعداد میں ہندو تھے۔ جس شہر میں سینکڑوں سال سے ہندو مسلمان سکھ چین شانتی سے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے آرہے تھے، اُس شہر میں کچھ عرصے سے غیر سماجی اور فرقہ پرست عناصر کا زور بڑھ رہا تھا۔ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے ڈرایا دھمکایا جا رہا تھا اِس لیے بھی مسلمان خوف اور دہشت کے سائے میں زندگی گزار رہے تھے لیکن مجید بھائی پر کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ ماڈرن خیالات کے ہوتے ہوئے بھی پختہ ایمان کے مالک تھے۔ زندگی، موت اور رزق خدا کی طرف سے معین ہے اُن کا یقین تھا۔ وہ کشادہ اور سیکولر ذہن کے بھی مالک تھے اور اُن کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ گھل مِل کے اور میل جول بڑھا کے ہی فرقہ پرست عناصر سے نپٹا جا سکتا ہے۔ اُن کی لڑکی روبینہ کالج میں پڑھتی تھی اور اپنے ہی فلور کے فلیٹ نمبر پانچ کے روی سکسینہ کے لڑکے نریندر کو بچپن ہی سے بہت چاہتی

تھی۔ روبینہ نے نریندر کو راکھی باندھ کر بھائی بنایا تھا۔ دونوں فلیٹوں کے لوگوں میں رشتہ داروں کی طرح محبت اور میل جول تھا۔ یہ لوگ اکثر ملتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے اور خبر لیتے رہتے تھے۔ دونوں گھروں کے لوگ جب کبھی فرصت کے لمحات میں بیٹھتے تھے تو اکثر فرقہ پرستی اور فسادات پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اِن کا خیال تھا کہ دونوں قوموں کے نوے فی صد لوگ نہ فرقہ پرست ہیں نہ جنگ جُو۔ نہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ کسی بھی نوعیت کا کام ہو اُس میں کسی نہ کسی سطح پر ہندو مسلم اشتراک ضرور ملے گا۔ ہندو ہو یا مسلمان، دونوں کے لیے شدّت پسندی ہی خرابی کی جڑ ہے۔ اعتدال پسندی، رواداری اور عدل و انصاف پر مبنی انسانی مساوات ہی ملک کو مضبوط اور طاقت ور بنا سکتی ہے۔

جب سے شہر میں فرقہ وارانہ دنگے شروع ہوئے تھے سب ہی فرقے کے لوگ خود کو غیر محفوظ محسوس کر کے خوف زدہ تھے لیکن مسلمان چونکہ بچاؤ کی پوزیشن میں تھے، کمزور تھے، غیر منظم تھے اور نہتّے بھی تھے اِس لیے جانی مالی نقصان اُنھیں کا زیادہ ہو رہا تھا۔ خوف کا احساس بھی اُنھیں میں زیادہ تھا۔ خاص طور پر ایسے مسلمان جو اِکّا دُکّا ہندوؤں کے محلّوں یا فلیٹوں میں رہتے تھے، گھر کی تمام بتیاں بند کر کے اندھیرے میں دہشت زدہ راتیں جاگ جاگ کر گزارنا اُن کا مقدر بن گیا تھا۔ مجید بھائی بھی اپنی بلڈنگ میں تنہا مسلمان تھے لیکن چونکہ حکومت کے اعلیٰ حلقوں تک اُن کی رسائی تھی، اثر و رسوخ کے مالک تھے، بلڈنگ کے لوگوں سے بھی اچھے تعلقات تھے اور بلڈنگ والے بھی اُن کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے، اُنھیں یقین تھا کہ دنگائیوں کی نگاہ اُن تک نہیں پہنچے گی اور تخریب کاری کا دائرہ جھونپڑیوں، جھگیوں اور غریب لوگوں کی بستیوں تک ہی محدود رہے گا۔

ایک رات باہر کچھ شوروغل کی آواز آئی۔ مجید بھائی نے باہر جھانک کر دیکھاتو سوڈیڑھ سودنگائی ہاتھوں میں تلوار، ترشول وغیرہ لیے جمع ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کچھ فہرستیں بھی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے نشانات معین کررہے ہیں۔ خطرہ محسوس ہوتے ہی اُنھوں نے فوراً پولس کوفون لگایا۔

''ہلو، ہلوگوراگنج پولس اسٹیشن''۔مجید بھائی نے پوچھا۔

''یس، گوراگنج پولس اسٹیشن، بولو بولو، کیابات ہے''۔اُدھر سے آواز آئی۔

''دیکھو، میں مجید بھائی فلاور بلڈنگ سے بول رہاہوں۔ یہاں بلڈنگ کے پھاٹک پرسوڈیڑھ سوتھیار بندلوگ کھڑے ہیں لگتاہے حملے کی تیاری میں ہیں''۔

''ٹھیک ہے ابھی بندوبست کرتے ہیں''۔ کہتے ہوئے ڈیوٹی پرتعینات کانسٹبل نے فون کاٹ دیا۔تھوڑی دیربعد مجید بھائی نے فریادبھرے لہجے میں پھرپولس اسٹیشن فون لگایا۔

''ہلوہلو، پولس۔ دیکھو میں مجید بھائی فلاور بلڈنگ سے بولتاہوں۔ دنگائیوں نے بلڈنگ کاپھاٹک توڑدیااور جے شری رام کے نعرے لگاتے ہوئے اندر گھس رہے ہیں۔پولس فورس فوراً بھیجو''۔

''ہم نے ہیڈکوارٹر کوخبر کردی ہے،فورس وہ لوگ بھیجیں گے،آگے تم ہیڈکوارٹر سے کانٹیکٹ (CONTACT) کرو۔تھانہ خالی ہے۔خالی پیلی فون مت کرو''۔کہہ کرڈیوٹی کانسٹبل نے فون بندکردیا۔

مجید بھائی پولس سے فون پر بات کرہی رہے تھے کہ کسی نے اُن کے فلیٹ کادروازہ زورزور سے پیٹ کرروبینہ روبینہ کی آواز لگائی۔روبینہ نے دروازے کی میجک آئی Magic Eye سے جھانک کردیکھاتو نریندر گھبرایاہوادروازہ

بھڑ بھڑا رہا تھا۔ روبینہ نے دروازہ کھول دیا۔ نریندر نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا ''سب لوگ ہمارے فلیٹ میں چلو۔ روبینہ تو بھی چل''۔ مجید بھائی بغیر کچھ سوچے سمجھے مع بیوی بچوں اور روبینہ کے، فلیٹ جیسا تھا ویسا چھوڑ کر، نریندر کے ساتھ دوڑ کر اُس کے فلیٹ میں گھس گئے اور دروازہ لگالیا۔ کچھ ہی لمحوں میں دنگائی لوگ زینے سے چڑھ کر سیدھے مجید بھائی کے فلیٹ میں گھس کر توڑ پھوڑ کر کے ''سالا بھاگ گیا'' کہتے ہوئے واپس ہو گئے۔

مجید بھائی کا عقیدہ اور ایمان مضبوط تھا۔ حرام کمائی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ دوسرے دن صبح اُنھوں نے اپنے بچوں سے کہا :

''یہ نقصان کیوں ہُوا، اِس پر ہمیں غور کرنا چاہیے اور جانے اَن جانے میں جو گناہ ہو جاتے ہیں اُن سے توبہ کرنا چاہیے۔ خدا کے غضب سے ڈرنا چاہیے۔ ہمارے والد بزرگوار کہتے تھے کہ حلال کمائی کو نہ کوئی لوٹ سکتا ہے، نہ چُرا سکتا ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اِس لیے توڑ پھوڑ میں جو ہمارا نقصان ہُوا اُس میں حرام مال ضرور شامل رہا ہوگا۔ جس طرح تھوڑا سا زہر بھی ایک ٹنکی کے پورے پانی کو زہریلا بنا دیتا ہے۔ اُسی طرح تھوڑا سا حرام مال بھی پورے حلال مال کو ناپاک کر دیتا ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار''

☆☆☆

۹-بیس سال بعد

''کپڑے اُتار''۔ جمالو چیخا

''مُ۔مُ۔ مجھے معاف کردو'' ریتو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو جوڑ کر کہا۔

''کمینے کہیں کے، مُسٹنڈے! مجھے پلنگ سے باندھ کر میری لڑکی کی عزت میرے سامنے لوٹنا چاہتا ہے۔ بُزدل کمینے۔کایر۔ مجھے کھول، پھر دیکھ کتنی ہمت ہے تجھ میں''۔

''بندھے رہے تم دونوں چُپ چاپ اور دیکھو تماشا''۔ جمالو نے ریتو کے باپ اور ماں (مدن اور رادھا) کو غصے میں ڈانٹا۔

''آج تم دونوں کے سامنے میں تمھاری لاڈلی بیٹی ریتو کی عزت لوٹوں گا۔ٹھیک اُسی طرح ،جس طرح تو نے آج سے بیس سال پہلے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ میری ماں اور میری بہن کی عزت لوٹی تھی۔ میں پاس میں پڑے ہوئے اپنے باپ کی لاش کی آڑ سے ڈراسہا ہُوا تیرے کرتوت دیکھ رہا تھا۔ یاد آیا، کُمھار پورہ۔ ڈیری کے پاس گلی نمبر ایک۔ دن کے بارہ بجے۔دنگوں کے زمانے میں کرفیو کے وقت۔ پھر تم دونوں نے باہر نکل کر پیٹرول چھڑک کر پورے مکان میں آگ لگا دی تھی۔ میرا باپ، میری بہن اور میری ماں وہیں جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ میں جلتے مکان کی کھڑکی سے کود کر بھاگ نکلا تھا''۔

''تو بھیّا تجھے جو چاہیے وہ لے لے لیکن معاف کردے میری ریتو کو۔ میرے قصور کی سزا اُس کو مت دے۔ ہماری پوری دَھن دولت لے لے ہماری جان لے لے مگر ہمارے سامنے یہ بُرا کرت مت کر''۔ دونوں گڑگڑائے۔

''دیکھ، ہلنے جُلنے کی کوشش مت کرنا۔ تیری پلنگ کے نیچے اور گھر میں اوپر نیچے بم رکھے ہیں۔ گڑبڑ کی تو پورے گھر کو ریموٹ کنٹرول دبا کر اڑا دوں گا''۔ جمالو نے وارننگ کے لہجے میں کہا۔ ''میں بیس سال سے انصاف کا انتظار کر رہا ہوں۔ پولس رکارڈ میں میرے ماں باپ فرار لکھے ہیں۔ تو نے یہ مکان لاوارث بتا کر افسروں کو رشوت کھِلا کر ''گئو رکشا سمیتی'' کے فرضی نام سے الاٹ کرا کے اپنی بلڈنگ تان لی۔ یہی ہے تیرا دھرم۔ یہی ہے تیری گئو رکشا؟

آج تیرے پاپ کا گھڑا میں پھوڑوں گا''۔

''کپڑے اُتار'' وہ ریتو سے مخاطب ہو کے پھر چیخا۔ اور گریبان میں خنجر ڈال کے ایک جھٹکے میں کُرتے کو دامن تک دو حصوں میں چاک کر دیا۔ لڑکی کے جسم کا اوپری حصہ برہنہ ہو گیا۔

''بھگوان کے لیے آگے کچھ مت کرنا''۔ مدن گڑ گڑایا۔

''تیری بیٹی کے ساتھ بلاتکار میں نہیں تو کرے گا۔ اُس کی ماں یعنی اپنی پتنی رادھا کے سامنے۔ اور میں دیکھوں گا ٹھیک اُسی طرح جس طرح آج سے بیس سال پہلے اپنے باپ کی لاش کی آڑ سے اپنی بہن کے ساتھ تجھے بلاتکار کرتے دیکھا تھا''۔

''نہیں نہیں مجھے چھما (معاف کر دو)''۔ ایک ہاتھ سے سینہ چھپائے اور ایک ہاتھ سے شلوار پکڑے ہوئے ریتو رونے لگی۔

''جا معاف کیا''۔ یہ کہہ کر اُس نے ریتو کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے دروازہ کھولتا ہوا باہر نکل گیا اور دور کھڑے ہو کر ریموٹ کنٹرول سے گھر کو اڑا دیا۔ ریتو کو سڑک پر نیم برہنہ چھوڑ کر بجلی کی طرح غائب ہو گیا۔

☆☆☆

۱۰- جے بجرنگ بلی

موہن اور شیخ بچپن کے ساتھی تھے۔ پنڈا پورہ جھونپڑپٹی ہی میں دونوں ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ اِس جھونپڑپٹی میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں رہتی تھیں۔ دونوں اپنے اپنے دھرم اور عقیدوں کے کٹر ماننے والے تھے لیکن سب ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے۔ عید، ہولی، دیوالی مل جُل کر مناتے تھے۔ یہ لوگ نہ قومی ایکتا کے نام سے واقف تھے نہ فرقہ وارانہ یکجہتی کا سبق کسی سے پڑھا تھا نہ یہ جانتے تھے کہ دیش بھکتی کس چیز کا نام ہے لیکن یہ لوگ پکے دیش بھگت اور قومی ایکتا کا نمونہ تھے۔ مذہب کے نام پر نفرت اور لڑائی ہوتی ہے اِنھیں معلوم بھی نہیں تھا۔ یہاں سب لوگ ہی غریب تھے اور تیسرے چوتھے درجے سے آگے شاید ہی کسی نے اسکول دیکھا ہو۔ اِس لیے سینکڑوں سال کی مشترک تہذیب اور رواداری کی اچھوتی وراثت کے یہ لوگ امین تھے۔ تاریخ کو بگاڑ کر نفرت پھیلانے والی نئی تعلیم کا کاروبار ابھی یہاں نہیں پھیلا تھا۔

شہر میں قریب دو مہینوں سے فرقہ وارانہ دنگے چل رہے تھے جو رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ جن ہاتھوں میں آگ کو بجھانے کی طاقت تھی وہ خود اُسے ہوا دے رہے تھے۔ ہندو مسلمان سے خوف زدہ تھا مسلمان ہندو سے۔ ہندو لوگ مسلم علاقوں سے گھر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو مسلمان بھی اپنے سینکڑوں برس کے ہندو پڑوسیوں سے ڈر کر مسلم محلوں میں پناہ لے رہے تھے۔ جن کا سب کچھ لُٹ پٹ گیا تھا یا جن کے

پاس کچھ نہیں تھا وہ اپنے ہی شہر میں پناہ گزیں خیموں میں مقیم تھے۔ ہندو مسلم کے خون کا پیاسا تھا تو مسلمان ہندو کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ لڑنے والے اور مرنے والے دونوں قوموں میں اکثر غریب لوگ ہی تھے۔ لڑنے والے ہر جگہ موجود تھے لیکن لڑانے والے ہاتھ نظر نہیں آتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس کل تک کھانے پینے کے برتن خریدنے تک کے پیسے نہیں تھے اُن کے پاس تلوار، بلم، پھرسے، طمنچے اور بم خریدنے کے لیے نہ جانے کہاں سے پیسے آگئے تھے۔

آج بہت دن کے بعد پہلی بار پورے دن کا کرفیو اُٹھتے ہی موہن اور شیخ مزدوری کے لیے نکلنے لگے تو موہن نے شیخ کی ڈاڑھی دیکھ کر مذاق کیا ''تو تو دور سے مسلمان نظر آتا ہے کوئی بھی تیرے چھرا گھونپ دے گا۔ میری مان تو یہ ڈاڑھی مونڈ دے''۔ شیخ ناراض ہو گیا کہنے لگا ''میں مسلمان ہوں، موت پر مجھے پورا یقین ہے کہ اپنے وقت پر ہی آئے گی اور جس بہانے سے لکھی ہے اُسی بہانے سے آئے گی۔ ڈاڑھی مونڈنے سے موت ٹل نہیں سکتی اور تیرے جیسا یار ساتھ ہے تو کیا ڈر''۔ موہن خاموش ہو گیا۔ دونوں کارپینٹری کرتے تھے اوزار اُٹھائے اور نکل پڑے۔ جن ٹھکانوں پر مزدوری مِل سکتی تھی اُن سب پر گئے لیکن جہاں شہر بھر میں آگ اور خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہو وہاں مکان کی تعمیر کا کام کون کرائے۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بھٹک بھٹکا کر دونوں ایک جگہ دیوار کے سائے میں سُستانے کو بیٹھ گئے۔ شیخ نے ایک بیڑی سُلگائی اور دو ایک کش لگا کر موہن کو پیش کی۔ موہن نے بیڑی منہ سے بھی نہیں لگائی تھی کہ سامنے کی گلی سے ''بچاؤ بچاؤ'' کی دل دوز چیخیں آئیں۔ اُس کی نظر تھوڑی ہی دور پر کھڑے دو سپاہیوں پر گئی لیکن شاید دونوں بہرے تھے یا اُن کی کارگذاری (ڈیوٹی) بیڑی دھونکنے سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس نے گھبرا کے تھوڑے فاصلے پر کھڑی پولس لاری کو دیکھا جس میں محافظ دستہ تعینات تھا۔ موہن نے چیخ کر مدد کے لیے پکار کی مگر وہ اپنے کان کسی

سیاسی پارٹی کو فروخت کر کے آئے تھے۔ اُس نے شیخ کا ہاتھ پکڑا اور بجلی کی رفتار سے گلی کی طرف لپکا۔ اُس نے دیکھا دو نوجوان ایک لڑکی کو دبوچے ہوئے ایک آٹو رکشا میں جبراً بٹھا رہے ہیں۔ شیخ نے اپنے جھولے میں سے بسُولا نکال کر اغوا کرنے والوں پر لڑکی کو چھڑانے کے لیے حملہ کیا۔ موہن کے ہاتھ ہتھوڑا پڑ گیا جس سے اُس نے بھی حملہ کر دیا لیکن مزدوری کے یہ اوزار ہتھیار کا کام کیسے کرتے۔ وہ دونوں نوجوان تلوار سے مسلّح تھے ایک نے شیخ کے پیٹ میں تلوار گھونپ دی اور وہ ایک دل دوز چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ موہن کو تھوڑا پہلوانی کا شوق بھی تھا۔ جسم ورزشی اور چست تھا۔ اُس نے اکھاڑے میں تلوار، بنیٹی چلانے کا ہنر بھی سیکھا تھا۔ اُس نے اپنا کرتب دکھا کر دونوں نوجوانوں کی تلواریں ہاتھوں سے گرا دیں۔ تلواریں ہاتھ سے چھوٹتے ہی دونوں اغوا کار نوجوان بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف شیخ، ایک طرف لڑکی۔ اُدھر پولس۔ اُس نے شیخ کو وہیں چھوڑ کر لڑکی کو لے بھاگنے کا فیصلہ کیا اور گلی میں ہی گھُس کر بچتا بچاتا اپنے گھر پہنچ گیا۔ اُس کی ماں اچانک ایک حواس باختہ اجنبی لڑکی کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ موہن بولا ”ماں یہ فاطمہ ہے یہ اناتھ لڑکی ہے اِس کے ماں باپ کو دنگائیوں نے مار ڈالا ہے۔ اب یہ تیری بیٹی ہے۔ میں اِس کا بھائی ہوں۔ میں نے اس کی جان بچائی ہے۔ آگے بھی میں جان دے دوں گا مگر اِس کی رکشا کروں گا۔ ماں ! میں آتا ہوں شیخ سڑک پر پڑا ہے“۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا اور جہاں شیخ پڑا تھا وہیں پھر پہنچ گیا۔ اُس نے دیکھا شیخ کی لاش غائب تھی۔ پولس لاری جا چکی تھی۔ دونوں سپاہیوں کی ڈیوٹی پوری ہو چکی تھی۔ وہ چیخا ”جے بجرنگ بلی۔ تیرا بھائی زندہ ہے شیخ۔ میں تیرے قتل کا بدلہ لوں گا“۔

☆☆☆

۱۱- کہاں جائیں

دس سال پہلے کے دنگوں میں کنیزہ کے شوہر کی موت ہوگئی تھی تب سے وہ اپنے اکیلے دَم پر گدّے رضائیوں میں روئی بھرنے اور تاگے ٹانکنے کا کام کر کے خود کی اور اپنی ایک معصوم بچی کی عزت آبرو کے ساتھ گذر بسر کر رہی تھی۔تیس بتیس (۳۰۔۳۲) سال کی چھوٹی سی عمر میں دو بڑے دنگے دیکھ چکی تھی اور بھگت چکی تھی۔کنیزہ اور اُس جیسے ہزاروں لوگوں نے دنگوں کی مصیبتیں جھیلنا، اُن سے نپٹنا اور گر پڑ کے اٹھنا اور زندگی کی گاڑی پھر کھینچنا شروع کر دینے کو زندگی کا معمول بنالیا تھا۔دنگوں سے متاثرین دو قسم کے تھے۔ایک تو وہ تھے جو تمام مصیبتوں اور آفتوں کو قسمت کا لکھا مان کر گاندھی وادی انداز میں ایک گال میں تھپڑ پڑنے پر دوسرا گال بھی پیش کر دیتے تھے اور لُٹ پٹ کے بھی زندگی کی گاڑی کو پھر پٹری پر لانے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جو گھونسے کا جواب لاٹھی سے دینے کو اپنا اصول مانتے تھے اور آگ کا جواب آگ سے دینے کے لئے فرقہ وارانہ تناؤ کے زمانے میں بم، بارود، تلوار بندوق کے کاروبار میں تنازعات کا حل ڈھونڈنے کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

کنیزہ کا تعلق گاندھی وادی خیالات سے تھا۔دو دو بار دنگوں میں برباد ہونے اور شوہر تک کو کھو دینے کے باوجود اُس نے کبھی منفی ردِ عمل ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔صبح

سے شام تک دکان پر کام کرنے اور اپنی بچی رئیسہ کی دیکھ ریکھ کرنے کے علاوہ اُسے اور کوئی کام نہ تھا۔ پچھلے دو بار کے دنگوں میں اُس کا پائے استقلال ڈگمگا نہیں پایا تھا۔ وہ مضبوطی سے اللہ پر بھروسا کر کے اپنی زمین پر جمی رہی لیکن اِس بار کے دنگوں کی نوعیت پچھلے دنگوں سے بالکل مختلف تھی۔ دکان مکان کے نقصان کے اندیشے سے زیادہ فکر اُسے اپنی بیٹی رئیسہ کی تھی جو جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ عورتوں اور بالخصوص لڑکیوں کے ساتھ بلاتکار اور اُس کے بعد زندہ جلادینے کے واقعات میں کمی کے بجائے روز اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر دور نزدیک اپنے احباب اور عزیزوں کے یہاں پناہ کے لیے بھاگ رہے تھے۔ کنیزہ کے محلے سے بھی کچھ خاندان اور بالخصوص ایسے جن میں جوان لڑکیاں تھیں، گھر دوار چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ افواہوں کا بازار گرم تھا۔ اِن حالات میں خطرات کے سیلاب کا دھارا اتنا تیز ہو گیا کہ کنیزہ کو اپنے پاؤں جمائے رکھنا مشکل ہو گیا اور آخر ایک روز وہ بھی اپنی بیٹی رئیسہ کو لے کر اپنے چچازاد بھائی کے گھر رتلام کے لیے در و دیوار پر دکھ بھری نظر ڈالتی ہوئی گھر سے نکل پڑی۔ ٹرینوں کا نظام درہم برہم تھا۔ معلوم ہُوا کہ رتلام کے لیے ٹرین صبح ملے گی مجبوراً پوری رات اسٹیشن پر غم واندوہ کی حالت میں گزاری اور صبح روانہ ہو کر شام ڈھلے اپنے بھائی سعید کے گھر رتلام پہنچ گئی۔ بھائی نے اُسے اور رئیسہ کو لٹا پٹا سا پریشان حال دیکھ کر فرطِ محبت سے گلے لگایا اور انتہائی محبت اور ہمدردی کے ساتھ سہارا دیا اور مستقل رتلام ہی میں رہنے بس جانے کے لیے اصرار کیا۔ بھائی کے گھر میں ہر قسم کے تناؤ سے آزاد ماحول میں ماں بیٹی، دونوں نے بڑی راحت محسوس کی اور دھیرے دھیرے زندگی نارمل سی ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔

کنیزہ کو رتلام آئے ہوئے دو ماہ ہونے والے تھے۔ اُدھر احمد آباد میں بھی حالات

معمول پر آنے کی خبریں مل رہی تھی اِس لیے بھائی کے منع کرنے کے باوجود وہ احمد آباد واپس لوٹنے کا پروگرام بنا ہی رہی تھی کہ ایک روز اچانک اُس کا دل متلانے لگا اور اُلٹیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُس کے بھائی کو جب معلوم ہُوا تو وہ دوڑ کر محلے ہی کے ایک نرسنگ ہوم کی لیڈی ڈاکٹر کو لے آیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک اَپ کر کے کہا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ تو ابتدائی ایام میں ہر عورت کو ہوتا ہی ہے کسی دوا علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ مہینے پندرہ روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیڈی ڈاکٹر کی یہ بات سُن کر گھر میں سب لوگوں کے چہرے فق ہوگئے۔ کنیزہ کے لیے بھی یہ انکشاف نا قابلِ برداشت تھا مگر وہ کیا صفائی پیش کرتی۔ کون اُس کی باتوں پر یقین کرتا۔ کنیزہ کی بھابی اپنے شوہر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کھسر پھسر کرنے لگی۔ رئیسہ بھی گھر کے پیچھے کے دالان میں منھ ڈھک کر چپ چاپ لیٹ کر رونے لگی۔ گھر کا یہ پُراسرار سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ کنیزہ کے کمرے سے ایک دل دوز قسم کی الٹی کی آواز کے ساتھ چیخنے کی آواز بھی آئی جس نے در و دیوار سے لپٹی ہوئی خاموشی کو اکھاڑ پھینکا۔ سب لوگ کنیزہ کے کمرے کی طرف دوڑے، وہاں دیکھا کہ کنیزہ کو خون کی الٹیاں ہو رہی ہیں۔ کنیزہ کا بھائی دوڑ کر اُسی لیڈی ڈاکٹر کو پھر بلا لایا جو تھوڑی دیر پہلے ہی کنیزہ کو دیکھ کر گئی تھی۔ اُس نے دیکھتے ہی کنیزہ کے سرہانے پڑی ''بیگن'' کی شیشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا زہر خوری کا کیس ہے، حالت نازک ہے فوراً نرسنگ ہوم لے چلیے۔ سعید اُسے نرسنگ ہوم لے کر پہنچا ہی تھا اور نرسیں اُسے ڈرپ وغیرہ لگا ہی رہی تھیں کہ پولس آ پہنچی۔ پولس جس وقت آئی اُس وقت کنیزہ کی حالت بہت نازک تھی لیکن اُس کے ہوش و حواس درست تھے۔ پولس نے اُس کا بیان ریکارڈ کرنا شروع کیا۔

''ڈیڑھ ماہ پہلے دنگوں کے زمانے میں اپنی جان اور آبرو بچانے کے لئے گھر سے چل کر شروع

رات ہی میں احمد آباد اسٹیشن پر آ گئی جب کہ ٹرین صبح ملی۔ رات گزارنے کی غرض سے چادر بچھا کر میں اور میری بیٹی رئیسہ زمین پر لیٹ گئے۔ پچھلی رات مجھے سنڈاس جانا تھا۔ میں لوٹا اٹھا کر لیڈیز ٹائلیٹ کی طرف گئی وہاں نل سے پانی بھر ہی رہی تھی کہ دونو جوان غنڈوں نے مجھے دبوچ لیا اور میرا منھ کپڑا ٹھونس کر باندھ دیا۔ لگیج روم کی دیوار کے سائے میں اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر دونوں نے باری باری سے بلاتکار کیا اور بھاگ گئے (یہاں سے کنیزہ کی آواز دھیمی پڑنے لگی) میرا جی چاہا کہ خوب چیخوں چلاؤں روؤں مگر سوچا کہ فرقہ وارانہ نفرت کے اس گھناؤنے ماحول میں میری فریاد کون سنے گا۔ کون اُن کمینوں کو پکڑے گا۔ پکڑ بھی لیا تو پولس مجھے تھانے کچہری کے چکر لگوائے گی۔ پولس کے سامنے شاید میں اُنھیں پہچان بھی نہ پاؤں۔ وہ چھوٹ جائیں گے مگر میری عزت پر جو داغ لگا ہے وہ کبھی نہیں چھوٹے گا۔ میں سماج کی نظر میں ذلیل اور رُسوا عورت بن کر رہ جاؤں گی اِس لیے میں نے آنسو پونچھ لیے، مُنھ بند کرلیا اور چُپ چاپ کنیزہ کے پاس آ کر لیٹ گئی۔ سعید بھائی جو کچھ میں نے کہا ہے خدا گواہ ہے ایک حرف بھی جھوٹ نہیں ہے۔ میں رئیسہ کو تمھارے حوالے کرتی ہوں''۔

کہتے کہتے اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

☆☆☆

۱۲-لاشوں پر بنیاد

''نام بول'' ہیڈ کانسٹبل نے بارعب آواز میں پوچھا
''محمد ابراھیم'' ابراھیم نے مرعوب انداز میں جواب دیا
''کیا کام کرتا ہے'' ہیڈ کانسٹبل
''خان پورہ میں سائیکل کی دکان تھی۔ مرمّت کے کام کے ساتھ کرائے پر بھی چلاتا تھا دس سائیکلیں تھیں۔ دوکان دنگے میں جل گئی۔ آج کل بے روزگار ہوں''
''خان پورہ ہمارے حلقے میں نہیں ہے اِس لیے ہم رپورٹ نہیں لکھ سکتے''۔ ہیڈ کانسٹبل
''صاحب سُنیے تو میں دکان نہیں مکان کی رپورٹ لکھوانے آیا ہوں''۔ ابراھیم چیخا
''ارے بولا نا بابا، خان پورہ ہمارے حلقے میں نہیں ہے۔ خالی پیلی کیوں بھیجا چاٹتا ہے۔ خان پورہ تھانے جا، مجھے اپنا کام کرنے دے'' ہیڈ کانسٹبل نے ڈانٹا اور کرسی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔
''صاحب ! صاحب ! بڑے سیٹھ سنیے تو''۔ ابراھیم چیختا ہی رہ گیا۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ کیا کرے کہاں جائے۔ کس سے داد فریاد کرے اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھانے کے ہی میدان میں نیم کے درخت کے نیچے سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ رپٹ لکھوانے کے لیے وہ صبح سے نکلا تھا۔ کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بھوک کے مارے اُس کا بُرا حال تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا، تھانے کے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے ہاتھ ٹھیلے سے تھوڑے سے بھُنے ہوئے چنے خریدے، وہیں کھڑے کھڑے کھائے اور پیاؤ سے پانی پیا تو کچھ جان میں جان آئی۔ وہ حوصلہ کر کے تھانے میں یہ طے کر کے داخل ہوا کہ اب اگر رپٹ نہیں لکھی گئی تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ شور مچا کے لوگوں کو جمع کر لے گا اور چلّا چلّا کے کہے گا۔ پولس اتیا چاری ہے۔ مکار

ہے۔ غریبوں کے ساتھ چھل کپٹ کرتی ہے۔ اگر میں غلط کہتا ہوں تو اِن سے پوچھو یہ میری رپٹ کیوں نہیں لکھتے۔ اِن کا کام واپس مجھے مکان دلا دینا تھوڑی ہے۔ اُس کے لیے تو کورٹ کچہری ہے لیکن انھیں چار لائن غریب کی فریاد لکھنا بھی منظور نہیں ہے۔ ابھی اُوپر سے کسی بڑے سیٹھ کا فون آجائے تو اُس کا حکم بجالانے میں پورا تھانہ لگ جائے۔ تُھ ہے ایسے پولس والوں پر۔ وہ غصے میں آگے بڑھا لیکن اُس نے دیکھا کہ کانسٹبل ایک نوجوان لڑکے کی بہت بے رحمی سے لات اور گھوسوں سے پٹائی کرر ہا تھا۔ اُس کی پیشانی زخمی تھی منہ سے خون آرہا تھا۔ کانسٹبل اُس سے بار بار یہ پوچھ رہا تھا.......... بول، جیب کاٹنے کے بعد تو نے پرس کس کو دیا۔ وہ گڑگڑا کے ہاتھ جوڑ جوڑ کے کہہ رہا تھا صاحب میں نے چُرایا ہی نہیں تو کس کو دوں گا۔ اِن صاحب (ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نے جبراً مجھے شک میں پکڑلیا۔ وہ خدا رسول اور اپنے ماں باپ کی قسمیں کھا کھا کر خود کو بے قصور بتا رہا تھا لیکن ہیڈ صاحب (کانسٹبل) کو اُسے مارنے اور اذیت پہنچانے میں مزہ آرہا تھا۔ جب وہ مارتے مارتے تھک گیا تو اُس نے نوجوان کو ہوا اور لات کھانے کے لئے حوالات میں بند کر دیا۔ ابراھیم نے دیکھا حوالات کے سلاخوں والے دروازے سے کئی چہرے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اُن میں کئی چہروں سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ اُسے ڈر محسوس ہوا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ خوف ناک مونچھوں والا ہیڈ کانسٹبل اُس پر بھی کچھ جھوٹا الزام لگا کر سلاخوں کے پیچھے کر دے۔ اگر ایسا ہُوا تو ضمانت دینے کون آئے گا۔ دنگوں کے بعد اُس کے بھائی کا بھی کچھ پتا ٹھکانہ نہیں ہے، پھر کون آئے گا چھڑانے۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ گرفتاری بھی نہ بتائے اور اُسے دنگائیوں کے حوالے کر دے۔ ابراھیم اِن پریشان کن خیالات میں گُم تھا کہ اُسے ایسا لگا جیسے اُس کا بھائی اُس سے کہہ رہا ہو، ''چھوڑ ابراھیم دکان اور مکان۔ لعنت بھیج سب کو

پائے تُرا لنگ نیست

ملکِ خدا تنگ نیست

تیرے لیے خدا کا ملک تنگ نہیں ہاں اِن بدمعاشوں کے لیے ضرور تنگ ہے اِسی

لیے تو اسے کشادہ کرنے کے لیے یہ لوگ گھروں کو برباد کر کے اور اُن کے رہنے والوں کو زندہ جلا جلا کے اُن کی لاشوں پر مندر کی بنیاد کھڑی کر رہے ہیں۔"

اس غیبی آواز کو سُن کر اُس نے تھانے سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ وہ پلٹا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اُس سے پوچھا "کیا کام ہے جو اِدھر سویرے سے چکّر مارتا"۔

"رپٹ لکھوانی تھی"۔ ابراہیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"رپٹ کا ہے کی"۔ سپاھی نے پوچھا

"میرے گھر کی"۔ ابراہیم نے جواب دیا

"کچھ نامہ پانی ہے" سپاھی نے اشارے میں دھیرے سے پوچھا

"ایک نوٹ ہے بیس کا"۔ ابراہیم نے کہا

"ٹھیک ہے، چلے گا، آ میرے ساتھ، نوٹ نکال"۔ سپاھی نے چلتے چلتے ابراہیم سے کہا

ابراہیم کو لے کر سپاھی رپٹ لکھنے والے ہیڈ کانسٹبل کے پاس لے جا کر بولا

"بھیکو بھائی۔ یہ غریب مانس کی رپٹ لکھ لو۔ سویرے سے کھوٹی ہو ریا"

"ٹھیک ہے، اِدھر آ۔ ہاں بول کیا نام ہے تیرا"۔ ہیڈ کانسٹبل بولا

"ابراہیم ولد عبدالکریم"۔ ابراہیم نے جواب دیا۔

"پتا" ہیڈ کانسٹبل

"لکشمی مل روڈ، مکان نمبر ۲۷"۔ ابراہیم نے بتایا

"گھٹنا"۔ ہیڈ کانسٹبل بولا۔

"لکشمی مل روڈ پر مکان تھا، نمبر ۲۷- میں اپنی بیوی کے ساتھ اُس میں رہتا تھا۔ مارچ میں دنگے زیادہ بھڑکے تو اپنی بیوی کو لے کر الہ آباد (یو پی) کے پاس ایک گاؤں میں اُس کے مائکے یعنی اپنی سُسرال چلا گیا۔ گھر سے نکلتے وقت گھر جیسا تھا ویسا کا ویسا ہی چھوڑ کر تالا لگا کر چل دیا۔ دو مہینے اِدھر اُدھر رشتے داروں کے یہاں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے رہ کر ٹائم پاس کیا۔ جب میرے پاس پیسے بالکل ختم ہو گئے اور احمد آباد میں شانتی کی خبر ملی تو میں نے

سوچا چلو پھر دھندا پانی شروع کیا جائے۔ بیوی کا زیور گہنا بیچ کر کرائے خرچ کا انتظام کر کے بیوی کو سسرال ہی میں چھوڑ کے یہاں آیا۔ اسٹیشن سے اتر کر سیدھا اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ سڑک سے گلی میں گھُستے ہی گلی کے مُنہ پر ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ جس کے ٹھیک سامنے میرا اور میرے بڑے بھائی کا مکان تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مکان کیسے غائب ہوگیا۔ ایک نہیں دو دو مکان۔ زمین نگل گئی کہ آسمان لے اڑا۔ باقی گھر جیسے تھے ویسے ہی اپنی جگہ تھے۔ بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا کہ مکانوں کی جگہ مندر بن گیا۔ میں کہاں جاتا۔ وہیں پاس ہی میرا ایک دوست شنکر رہتا ہے اُسے میرے مکان ٹوٹنے کا پورا قصہ معلوم تھا میں ہچکچاتے ہوئے اُس کے پاس گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ بدلے ہوئے ماحول میں شنکر بھی نہ بدل گیا ہو لیکن شکر ہے کہ اُس نے دوستی نبھائی۔ اتنے تناؤ کے ماحول میں بھی اُس نے میرا سامان رکھ لیا۔ مجھے ڈھارس دی۔ کھانا بھی کھلایا۔ رات میں اُسی کے گھر سویا۔ صبح سے فریاد لے کر تھانے میں پھر رہا ہوں''۔

''مکان کی رجسٹری کہاں ہے''۔ ہیڈ کانسٹبل بولا

''مکان تو پشتینی ہے۔ اِس لیے رجسٹری نہیں ہے۔ ہبہ نامہ تھا مگر وہ جس پیٹی میں رکھا تھا اُسے گھر میں چھوڑ کر میں گھبراہٹ میں بھاگ گیا تھا مگر اب تو وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ سب جل کر راکھ ہوگیا اور راکھ بھی صاف ہوگئی''۔ ابراہیم نے صفائی پیش کی

''ٹھیک ہے وہ نہیں تو نل بجلی کی رسید''۔ ہیڈ کانسٹبل نے پوچھا

''وہ بھی گھر میں ہی تھی''۔ ابراہیم نے بتایا

''تو پھر کیا ثبوت ہے کہ تیرا گھر تھا وہاں جہاں مندر ہے''۔

''صاحب پورے محلّے میں پوچھ لو، میرے باپ دادا وہیں اُسی گھر میں مرے''۔

''محلّے والوں سے پوچھنا ہمارا کام نہیں ہے۔ چل ہٹ۔ پھوٹ اِدھر سے''۔ کہتے ہوئے ہیڈ کانسٹبل اٹھ کر چل دیا۔

☆☆☆

۱۳۔ یہ بھی ایک ''ردِّ عمل''

رنگ پور روڈ کی ایک بلڈنگ میں اوپر کی منزل پر ایک سائن بورڈ لگا تھا۔

''مانو سہایتا کیندر''

دنگوں میں جو لوگ لُٹ پٹ گئے تھے یا جن کی دکانیں مکان برباد ہو گئے تھے۔ اُنھیں باز آباد کاری میں رہ نمائی کے ساتھ مستحق لوگوں کو مالی امداد بھی دی جاتی تھی۔ بہ ظاہر اِس ادارے کو پورے ملک سے چندے کی رقومات اور عطیات حاصل ہوتے تھے لیکن جس سخاوت اور دریا دلی سے یہاں امدادی رقم تقسیم کی جاتی تھی وہ ادارے کی آمدنی کے ذرائع کے بارے میں شبہات کو جنم دیتی تھی۔

ایک روز ایک نوجوان امداد حاصل کرنے کے لئے آیا۔ ورزشی جسم، دراز قد، خوب رو، چہرے پر کچھ کر گذرنے کا جوش وخروش۔ سہایتا کیندر کے سیکریٹری نے اپنے بند کمرے میں انٹرویو کے لیے بُلایا۔

''نام'' سیکریٹری نے پوچھا

''جی، عبدالشکور''۔ نوجوان نے بتایا

''تعلیم'' سیکریٹری

''ایم۔ ایس۔ سی''۔ نوجوان

''وطنیت''۔ سیکریٹری

''احمد آباد شہر''۔ نوجوان

''پتا''۔ سیکریٹری

''۹ رکلفٹن روڈ''۔ نوجوان

''شادی ہوئی''۔سیکریٹری

''جی نہیں''۔نوجوان

''والدین''۔سیکریٹری

''والدہ کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا۔والد صاحب اور ایک چھوٹی بہن تھی جو حالیہ دنگوں میں شہید ہوگئے''۔نوجوان

''گڈ''۔سیکریٹری

''والد صاحب کیا کرتے تھے''۔سیکریٹری

''آرمس ڈیلر تھے، بہت اچھے نشانے باز تھے۔مجھے ہتھیار چلانے اور آرمس ہینڈلنگ arms handling کی تربیت اُنھیں نے دی۔آتش گیر ہتھیار Explosives کی پوری ٹیکنک سے میں واقف ہوں''۔نوجوان

''تم جینا چاہتے ہو یا مرنا''۔سیکریٹری

''مر کے جو زندگی ملتی ہے اُسے ترجیح دیتا ہوں''۔نوجوان

''ویری گڈ، شاباش''۔سیکریٹری

''مانو بم کے بارے میں جانتے ہو؟''

''جی ہاں !جانتا ہوں''۔نوجوان

''بہت خوب''۔سیکریٹری

''تمھیں ماہانہ کتنی رقم درکار ہوگی''۔سیکریٹری

''میں کم سے کم خرچ میں جینا چاہتا ہوں۔سخت کوشی اور سخت جانی کے لیے یہ ضروری ہے۔''نوجوان

''تم ہم سے رابطہ رکھو۔جب ضرورت ہوگی بُلا لیا جائے گا۔OK !''۔سیکریٹری

''جی ! شکریہ، خدا حافظ''۔نوجوان

☆☆☆

۱۴- بھولا ناتھ

اسٹیشن پر کھڑے ہو کر مانگنے والوں میں ایک جوان بھکاری تھا بھولا ناتھ اور ایک بھکارن تھی نصیبن بائی۔ بھولا ناتھ عام لوگوں کی ہمدردی حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ بھیک حاصل کرنے کے لیے نئے نئے سوانگ رچتا تھا۔ کبھی کچا قیمہ گھٹنوں اور پنڈلی میں کپڑے سے باندھ کر لوگوں کو سڑے ہوئے زخم کا تاثر دیتا تھا۔ کبھی گلے سے کپڑے کی بڑی گیند میلے کپڑے سے باندھ کر میندیا کینسر کا مریض ظاہر کرتا تھا۔ نصیبن بائی بھی پیٹ بھرنے کے لئے نت نئے سوانگ کرتی تھی کیونکہ اِس پیشے میں بھیک دینے والوں کی توجہ اور ہمدری ضروری تھی۔ ہر دھندے کے کچھ رہنما اصول ہوتے ہیں اور جب تک اُن پر عمل نہ کیا جائے کامیابی نہیں ملتی۔ بھولا ناتھ اور نصیبن بائی اِس دھندے میں ماہر بھی تھے اور پارٹنر بھی تھے۔ دونوں مل کر خوب کماتے اور شام کو کسی ایرانی کے ہوٹل کے سامنے بیٹھ کر کباب بریان اڑاتے۔ کبھی کبھی ڈرنک بھی کرتے اور اندھیرے میں کہیں بھی فٹ پاتھ پر سو جاتے۔ بزنس پارٹنر شپ نے دونوں کو زندگی کا بھی پارٹنر بنا دیا تھا اور دونوں جی جان سے ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔

گودھرا ریل حادثے کے بعد بھڑ کے دنگے اگر چہ زیادہ تر مسلمانوں کے علاقوں تک ہی محدود تھے۔ لیکن اِن مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہندوؤں کی بھی کافی جائدادیں تھیں اور رہتے بھی تھے اِس لیے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جانے کے مصداق ہندوؤں

کا بھی مالی نقصان ہوا۔ کہیں کہیں ہندو مارے بھی گئے۔ اِس لیے ایسے متاثرہ علاقوں سے ہندو بھی اپنی جان مال اور آبرو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے۔ جن کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں تھا اُنھوں نے ریلیف کیمپ میں پناہ لی۔ ہندو ریلیف کیمپ میں آنے والوں میں زیادہ تعداد بھولا ناتھ اور نصیبن بائی جیسے لوگوں کی تھی جو عام دنوں میں بھی ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، درگاہیں، مندر مسجد وغیرہ پر دن بھر کھڑے ہو کر بھیک مانگتے تھے اور شام کو فٹ پاتھ پر یا جہاں جگہ ملے سو جاتے تھے۔ دنگے بھڑ کنے کے بعد جب کام دھندا بند ہو گیا اور فٹ پاتھ کے ٹھکانے بھی پولس نے اکھاڑ دیے تو بھولا ناتھ اور نصیبن بائی ہندو ریلیف میں بھرتی ہو گئے۔ دو چار دن کے اندر ہی وہاں موجود کچھ بھکاریوں نے نصیبن بائی کو پہچان لیا۔ ''ارے یہ تو مسلمان ہے یہاں کیسے'' ایک نے بھولا ناتھ سے سوال کیا۔ بھولا ناتھ بولا'' کیا فرق پڑتا ہے بھائی مسلمان ہونے سے۔ آخر کو انسان تو ہے نا۔ اور اُس کے یہاں رہنے سے کون سا ہندوؤں کا نقصان ہو رہا ہے''۔

'' نہیں نہیں ایک مسلمان عورت ہندو کیمپ میں نہیں رہ سکتی'' کہتے ہوئے ان لوگوں نے منتظمین سے شکایت کر دی۔ منتظمین نے شکایت کو جائز مانتے ہوئے اُسے کیمپ سے نکال دیا۔ وہ چلی گئی۔ کچھ دیر بعد بھولا ناتھ بھی کیمپ چھوڑ گیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہُوا کہ بھولا ناتھ بھولو خان بن کر اور نصیبن بائی کو بیوی بتا کر مسلم ریلیف کیمپ میں بھرتی ہو گیا۔

☆☆☆

۱۵- مداخلتِ بے جا

(TRESPASS)

شہر کے ایک سرے پر واقع تیلی واڑہ جھگی جھونپڑی بستی میں رہنے والے غریبی کی ریکھا کے نیچے کے لوگ تھے۔ بھیک مانگنے والے، دہاڑی مزدوری کرنے والے، گھروں میں جھاڑو پونچھا لگانے اور برتن مانجھنے والی عورتیں ہوٹل میں برتن دھونے والے، کچرا بیننے والے، جوتے چپل سینے اور پالش کرنے والے وغیرہ۔ اِن میں ہر قوم کے لوگ تھے لیکن غریبی نے سب کو ایکتا کے مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ یہاں اونچ تھی نہ نیچ۔ چھوت چھات تھی نہ نفرت۔ مندر مسجد یا دھرم کے نام پر لڑنا بھڑنا اور نفرت کا تصور بھی اِن لوگوں میں نہیں تھا۔ یہاں ہندو مسلمان سب کی جھگیاں قریب قریب برابر تعداد میں تھیں۔

شہر میں فرقہ وارانہ دنگوں کا جان لیوا اثر سب سے پہلے اِس غریب بستی پر ہُوا تھا۔ روز کنواں کھودنے اور روز پانی پینے والوں کے لیے کنوئیں کی زمین بند ہوگئی تھی۔ غیر میعادی کرفیو نے بھوکا مرنے کے ساتھ پیاسا رہنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کیونکہ اس بستی میں نل تھا ہی نہیں۔ یہ بے چارے تو بس خدا کے بھروسے اور امداد باہمی ہی پر زندہ تھے۔

کرفیو کے جاری رہتے ہوئے ایک رات کے آغاز میں جب کہ زیادہ لوگ جاگ رہے تھے نعرے لگاتے ہوئے اور مشعلیں اٹھائے ہوئے کچھ لوگوں کے آنے کا شور بستی کے

قریب آتا ہوا نظر آیا۔ سب لوگ گھبرا گھبرا کر بھاگنے یا بچنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں مشعل برداران لوگوں نے جے شری رام کے نعرے لگاتے ہوئے چاروں طرف سے جھونپڑیوں کو گھیر کر آگ لگا دی۔ دہشت اور وحشت میں گھبرا گھبرا کر سب ہی جھگی والے برتن بھانڈے چھوڑ چھوڑ کر پاس کے ایک غلیظ نالے میں چھپ گئے۔ اِدھر دنگائی اپنا کام کر کے بھاگے اُدھر فائر بریگیڈ نے آ کر آگ بجھانے کے ساتھ سب ہی جلی اَدھ جلی جھگیاں اور اُن کے اسباب کو پانی کے پریشر سے نزدیک کے اُسی گندے نالے میں بہا کر میدان کر دیا جہاں ان جھگیوں کے غریب لوگ پناہ لیے ہوئے تھے۔

صبح ہونے اور کرفیو اُٹھنے پر جھگی والے جب نالے سے باہر آئے تو اُنھیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی میدان ہے جہاں کچھ گھنٹے پہلے تک یہ لوگ آباد تھے۔ اُس سے بھی زیادہ حیرت اِس بات کی تھی کہ وہاں ایک بڑا سائن بورڈ زمین پر مضبوطی سے لگا ہُوا تھا جس پر انگریزی، گجراتی، ہندی اور اُردو سب زبانوں میں لکھا تھا۔

پلاٹ کے مالک

میسرز جے شری رام اینڈ کمپنی لمیٹیڈ انجینئرس، ڈیولپرس، بلڈرس، احمد آباد

مداخلتِ بے جا ممنوع۔ مداخلت کاروں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔"

☆☆☆

۱۶- اور ہنی مون نہ ہو سکا

ہیرابن سات آٹھ ہزار آبادی کا ایک چھوٹا سا مضافاتی قصبہ تھا جہاں زیادہ آبادی کا تعلق کھیتی کسانی اور تمباکو کے بیوپار سے تھا۔ اِس قصبے میں مسلمانوں کے گھر گنتی کے تھے لیکن سب اپنے اپنے پشتینی کاروبار میں لگے ہوئے بے خوف وہراس سکھ چین شانتی سے عزت کے ساتھ گذر بسر کرتے تھے۔ آزادی کے بعد سے لے کر بابری مسجد گرائے جانے کے واقعے تک یہاں کی فرقہ وارانہ کبھی مکدّر نہیں ہوئی تھی لیکن پچھلے آٹھ دس سال سے باہر کے کچھ لوگ اگر ماحول بگاڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور گاؤں کے بھولے لوگوں میں پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ صرف ایک رام مندر بنانے کا سوال ہے لیکن مسلمان اُسے بلی نہیں بننے دے رہے ہیں۔

گاؤں میں کریم بھائی کا گھر ایک بس اسٹاپ کے سامنے تھا جہاں سے پیر خاں کی لڑکی نجمہ روز بڑودہ کے گرلس کالج کی بس میں سوار ہوتی تھی۔ کریم بھائی کا لڑکا سلیم اگرچہ نجمہ کو لڑکپن سے دیکھتا آ رہا تھا مگر اِس سال جب سے وہ شہر سے ایم۔ ایس۔ سی کر کے گاؤں واپس آیا تھا اُسے نجمہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ کالج بس کے آتے جاتے دونوں وقت وہ کھڑا ہو کر نجمہ کا انتظار کرنے لگا تھا۔ نجمہ کے دکھائی دیتے ہی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اور وہ ترچھی نظر سے چوری چوری دیکھتا رہتا تھا۔ نجمہ بھی سلیم کی نگاہوں میں پوشیدہ پیغام کو جھکی جھکی آنکھوں سے پڑھنے میں دل چسپی لینے لگی تھی۔ سلیم کے دل ودماغ پر ہر وقت نجمہ چھائی رہنے لگی تھی لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نجمہ سے اپنے جذبات

محبت کا اظہار کس طرح کرے۔ کنکھیوں سے دیکھنے کا یہ سلسلہ دھیرے دھیرے نگاہوں سے ہوتا ہوا پیام وسلام کی حد میں داخل ہو گیا تھا۔

اِسی دوران گودھرا ریل حادثہ ہو گیا۔ جولن ۲۰۰۱ء کے قدرتی زلزلے سے بھی زیادہ طاقتور اور تباہ کن انسان کے ذریعہ لایا گیا زلزلہ ثابت ہوا۔ جس نے نہ صرف گجرات بلکہ پورے ملک کو ہلا دیا۔ اُس قدرتی زلزلے میں صرف مکان ٹوٹے تھے۔ اس فرقہ وارنہ زلزلے میں دل بھی ٹوٹ گئے۔ ہیرابن گاؤں اگرچہ ہمیشہ سے روایتی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مرکز تھا مگر گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس میں کارسیوکوں کے زندہ جلا دینے اور اُس کے بعد پھیلی افواہون نے ہندوؤں کے دل میں شگاف ڈال دیے۔ تھوڑے سے نہتے مسلمان جن کو مسجد مندر کے جھگڑے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا ہندوؤں کے غیظ وغضب کا شکار ہو گئے۔ ہیرابن جیسی چھوٹی سی بستی میں ''بند'' کا اعلان کر کے مسلم شدت پسندی کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگاتے ہوئے جلوس نکالا گیا۔ جلوس کا تو نام تھا اصل میں مسلمانوں پر طے شدہ پروگرام کے تحت ایک منظم حملہ تھا۔ جلوس کی بھیڑ نے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹنا، برباد کرنا اور جلانا شروع کر دیا۔ کچھ مسلمان جان سے بھی مارے گئے۔ دنگوں کی شدّت جلے اَدھ جلے گھروں اور دنگائیوں کی جبر و دہشت نے مسلمانوں کو غیر محفوظ کرنے کے ساتھ اُن کے حوصلے بھی پست کر دیے اور اُنھیں جان مال اور آبرو بچانے کے لیے بھاگنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ بڑودہ کی ایک سرائے میں راحتی کیمپ قائم ہو گیا تھا۔ ہیرابن کے سبھی مسلمان وہاں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔

جس اسٹاپ سے نجمہ کالج بس میں سوار ہوتی تھی اُسی اسٹاپ سے کریم بھائی کا خاندان مع سلیم راحت کیمپ کے لیے بس میں سوار ہُوا۔ بس میں چڑھتے وقت سلیم بڑی حسرت سے بس اسٹاپ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں نجمہ اور کالج بس کے منظر دوبارہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ نجمہ کے تصور میں گُم ہو کر نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ راحت

کیمپ آ گیا۔ وہاں کریم بھائی کی فیملی کو ایک کمرے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ لیٹنے بیٹھنے کے لائق جگہ مل گئی۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد سلیم کیمپ کا جائزہ لینے اور اپنے گاؤں کے لوگوں سے ملنے جلنے کی غرض سے نکلا۔ اُس نے دیکھا دو کمروں کے بعد تیسرے کمرے میں نجمہ خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز میں مصروف ہے۔ اُسے اِس حال میں دیکھ کر سلیم کے ضمیر نے بڑی ملامت کی۔ جان، مال، عزت اور آبرو پر دنگوں کی تلوار لٹکی ہونے کے باوجود وہ خدا کو بھولا ہوا ہے۔ اُسی وقت اُس نے نماز کی پابندی اور گناہوں سے توبہ کرنے کا عہد کیا۔ کچھ دیر کے بعد سلیم نے پھر نجمہ کے کمرے کی کھڑکی سے اُسے جھانکا تو اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ نجمہ آٹھ دس لڑکیوں / عورتوں کو جمع کر کے پند و نصائح کی کتاب میں سے کچھ پڑھ کر سنا رہی ہے۔ اُسے اپنے کمرے کے لوگوں کی حالت پر سخت افسوس ہُوا جو یادِ خدا کرنے کے بجائے ہر وقت منتظمین کی طرف سے ملنے والی چائے، ناشتہ کھانے وغیرہ کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے پھر کھا پی کر گھنٹوں ان کھانے پینے کی چیزوں کی برائی کرتے تھے۔ کیمپ میں بدانتظامی کی شکایت کرنے اور کوسنے میں تمام توانائی صرف کرتے تھے۔ گورنمنٹ کو گالیاں دیتے تھے۔ کچھ لوگ تاش چوسر کھیل کر ٹائم پاس کرتے تھے۔ بہت سے پان بیڑی سگریٹ کی اُدھیڑ بُن میں پھرتے رہتے تھے۔ بہت سے لوگ کچا پکا امدادی کھانا کھا کر ہر وقت خوابِ خرگوش میں مبتلا رہتے تھے۔ نجمہ کا کردار دیکھ کر سلیم کے دل میں اُس کی محبت کے ساتھ ایک احترام کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا اور اُس سے ملنے کی خواہش نے شدّت اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد سلیم نے کمرے کی کھڑکی سے پھر جھانک کر نجمہ کو اپنا چہرہ دکھایا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ جب کہ اِس پناہ گاہ میں مردوں عورتوں کا اختلاط عام تھا اور معیوب بھی نہیں تھا۔ کسی وقت نجمہ کسی کام سے اگر اپنے کمرے کے باہر بھی ہوتی اور سلیم بات کرنے کے لئے اُس کی طرف لپکتا تب بھی وہ رُکنے کے بجائے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ سلیم کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اُس کمرے میں جائے اُسے آواز دے کر روکے۔ چار چھ روز

اِسی طرح گذر جانے کے بعد ایک روز سلیم نے اُسے کمرے کی کھڑکی سے بہت التجا بھرے انداز میں باہر آنے کے لیے کہا۔ نجمہ ہمت کر کے نظریں جھکائے باہر آ گئی۔ سلیم نے اظہارِ محبت کے دو چار جملے مُنھ سے نکالے ہی تھے کہ نجمہ نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے ہم اِس وقت یہاں ایک منی میدانِ حشر میں کھڑے ہیں۔ خدا نے دُنیا میں ہی ہمیں میدانِ حشر کا اندازہ کرا دیا ہے۔ سب نفسی نفسی میں مبتلا ہیں لیکن چوں کہ یہ دنیوی محشر ہے اِس لیے توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ یہ توبہ کا وقت ہے محبت کا نہیں"۔

یہ وعظ بیان کر کے وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ نجمہ کی اِن باتوں سے سلیم کا دل ٹوٹ گیا۔

راحتی کیمپ میں چوں کہ قیام طویل تھا اِس لیے لوگ آپس میں گھل مل گئے تھے۔ ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مختلف جگہ سے یہاں جمع ہوئے اِن پناہ گزینوں میں بہت جوان لڑکیاں لڑکے ایسے تھے جو یتیم تھے یا دنگوں میں یتیم ہو گئے تھے۔ کچھ لڑکے لڑکیوں کی ہلدی مہندی لگنے والی تھی کہ دنگے پھوٹ پڑے تھے۔ بہت لڑکیوں کا جہیزی سامان مکان کے ساتھ نذرِ آتش ہو گیا تھا۔ زندگی آخر زندگی ہے۔ لوگ قبرستان میں میت کے دفن ہونے کے دوران ہی رشتے طے کرنے اور شادی بیان کی باتیں کرتے ہیں۔ پھر یہ تو راحتی کیمپ تھا۔ نئی زندگی آغاز کرنے کے پہلے رُک کر کچھ سوچنے سمجھنے کی جگہ۔ سبھی قابل شادی لڑکے لڑکیوں، یتیموں اور بیواؤں کو ازدواجی سہارا دے کر نئی زندگی آغاز کرنے کی غرض سے کیمپ کے کچھ خیر اندیش بزرگوں نے شادی بیاہ کی بات چیت کے سلسلے شروع کیے۔ جوڑے تلاش کرنا ملانا اور اُن کے والدین وغیرہ سے بات کر کے رشتے پختہ کرنا۔ کچھ ہی دنوں میں کیمپ میں ہر طرف ہر شخص شادی بیاہ کی باتیں کرتا ہوا نظر آیا۔ اِس ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلیم نے بھی اپنی ماں سے نجمہ کا ذکر کیا۔ سلیم کے ماں باپ نجمہ کے

والدین سے کیمپ میں قیام کے دوران بہت قریب آ گئے تھے۔ اُنھیں نجمہ اچھی لگتی تھی۔ ایک روز سلیم کے والد نے نجمہ کے والد کے سامنے تجویز پیش کی جسے اُنھوں نے صلاح ومشورہ کے بعد منظور کرلیا۔ کیمپ ٹوٹنے کے دن قریب آ رہے تھے۔ ہر طرف سے امن وامان بحال ہونے کی خبریں مل رہی تھیں اِس لیے کیمپ ٹوٹنے سے پہلے ہی جو رشتے پختہ ہو گئے تھے اُن کی اجتماعی شادی کا پروگرام بنایا گیا لیکن یہ طے ہُوا کہ نکاح کے بعد لڑکیاں اپنی مرضی کے مطابق چاہے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں چاہے اپنے شوہر اور سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ یا دونوں جگہ لیکن ازدواجی اختلاط اپنے اپنے گھر لوٹنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ اجتماعی شادی میں سلیم اور نجمہ کا نکاح بھی ہو گیا اور اس کے کچھ دن کے اندر ہی ہیرابن گاؤں کے لوگ بھی اپنے گھروں کے لیے روانہ ہو گئے۔

بس میں نجمہ اور سلیم ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھے ہوئے دل ہی دل میں ہنی مون منانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نجمہ کے والد کریم بھائی سے کہہ رہے تھے کہ نجمہ کو پہلے ہم اپنے گھر لے جائیں گے۔ آپ بارات لے کر رخصتی کرانے آئیے۔ یہ سب باتیں ہو رہی تھیں کہ ہیرابن گاؤں کا بس اسٹینڈ آ گیا۔ سب لوگ خوشی خوشی اتر ہی رہے تھے کہ کچھ قانون شکن نوجوانوں نے بس کو گھیر لیا اور خبردار کرتے ہوئے کہا کہ اِس گاؤں کی شُدھی ہو چکی ہے اب آپ لوگ اِس گاؤں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ واپس جائیے ورنہ ابھی بس کو بھی سابرمتی ایکسپریس کی بوگی نمبر S-6 بنادیں گے۔ ایک نوجوان نے کہا ''آپ لوگوں نے ہمارے خلاف لوٹ، ہتیا، آگ زنی اور بلاتکار کی رپورٹ لکھوائی ہے اب پولس سے ہی پوچھیے کہ آپ کو کہاں رہنا ہے''۔ ایک دوسرے نوجوان نے کہا ''آپ لوگ بہتر ہے کہ اجودھیا جا کر بابری مسجد پُنر نرمان کا کام شروع کر دیں''۔ کریم بھائی نے ایک نوجوان سے جواُن کا شناسا تھا کہا ''بیٹا ہم اپنے گاؤں میں نہیں رہیں گے تو کہاں رہیں گے''۔ نوجوان نے جواب دیا ''چاچا، اب آپ لوگوں کو کیمپ ہی میں رہنا ہے''۔

☆☆☆

حصہ دوم

گجرات المیہ (۲۰۰۲)

کے پس منظر میں لکھے گئے نظمانے

آئڈیا

سنجو منجو نے دیکھا

بھیڑ بہت ہے گاڑی میں

سنجو کے ذہن میں فوراً

آئڈیا آیا،

پاس کے PCO سے اُس نے

تھانے کو اک فون کیا۔

بوگی نمبر سیون میں

سترہ اٹھارہ نمبر کی سیٹوں پر

دو ڈاڑھی والے بیٹھے ہیں

(SIMI) سیمی یا ISI (آئی ایس آئی) کے ایجنٹوں جیسے

لگتے ہیں

دوڑو، گاڑی جانے والی ہے !

تھوڑی ہی دیر میں پھر منظر بدلا

سترہ اٹھارہ نمبر کی سیٹوں پر سنجو منجو بیٹھے تھے۔

☆☆☆

پوجا

غیر سماجی لوگوں کے
پچھلے کچھ ہفتوں سے
شہر پہ حملے جاری ہیں
صرف نہتوں، کمزوروں اور لاچاروں پر
تالے لگے ہیں مسجد میں
اور نمازی غائب ہیں
مندر کے سب دروازے کھلے ہیں
لیکن سناٹا ہے
بھگوان کے سارے بھکت پجاری
لاشوں کے ڈھیروں میں گھس گھس کر
سونے چاندی کے زیور نوچ رہے ہیں،
اور اُدھر کچھ بھکت پجاری
اَن جنمے بچوں کی
ہتیا کر کے
اُن کے لہو سے تلک لگانا
پوجا سمجھے ہیں

☆☆☆

ایک بُڑھیا

اک لاوارث بڑھیا

ڈنڈا ٹیکے

کوچہ کوچہ

اپنے پوتے پوتی اور ناتی نا تن کو

ڈھونڈا کرتی ہے

ہر اک سے اُن کے بارے میں

پوچھا کرتی ہے

لوگ اُس کو دیکھ کے ڈرتے ہیں

بچ بچ کر اُس سے چلتے ہیں

سب کو یہ خطرہ ہے

رکنے والے سے بڑھیا کہہ دے

تو میرا بیٹا ہے۔

☆☆☆

دوسری بڑھیا

اک بڑھیا لندن سے آئی ہے

دنگوں میں اُس کے بیٹے، شوہر

سب مارے گئے

کوٹھی جل کر ڈھیر ہوئی

لیکن بینک ڈپازٹ ہے

لاکر میں نقدی، ہیرے اور موتی ہیں

لاکھوں کے شیرس کی مالک ہے

لوگ اُس سے ملنے کو دیوانے ہیں

سب یہ خواہش لے کر اُس سے ملتے ہیں

شاید وہ کہہ دے

''تو میرا بیٹا ہے''۔

☆☆☆

نئی ترکیب

سنگم ہوٹل تو سرکاری ہے

ڈاڑھی والے کا کیسے قبضہ ہے ؟

موہن نے سوہن سے پوچھا

سوہن بولا

ہوٹل تو سرکاری ہے

لیکن ڈاڑھی والے کو

جیون بھر کی لیز پہ ہے

دو ہفتوں کے بعد

اک دن موہن نے یہ فون کیا

ڈاڑھی والا مارا گیا

تو لیز کی اک عرضی لکھ کر

صبح کلکٹر سے

اُس کے گھر پر جا کر مل لینا

ہوٹل تجھ کو مل جائے گا۔

☆☆☆

آدم خور

وہ آدم خور ہے
شاطر ہے، پیچھے سے جھپٹتا ہے
شکاری ہے وہ کمزوروں کا
اُن کا خون پیتا ہے
مگر کب تک گلا کاٹے گا وہ میرا
زباں کے تیز کانٹوں سے
لہو چوسے گا وہ میرا
کوئی تو پنجے توڑے گا
کوئی تو ڈاڑھ اکھاڑے گا
لہو سے زخم
زخموں سے لہو کے شعلے اُٹھیں گے
ہوائے وقت کا بدلے گا رُخ جس دن
یہی شعلے پلٹ کر وار کردیں گے۔

☆ ☆ ☆

تڑاتڑ تڑتڑاتڑ تڑ

یہ مقتل جس کو اب مسلخ کہا جائے

پکڑ کر اِن کے قصابوں کو

اُن کے خنجروں سے ہی

کسی دن وقت کا جلّاد

اُنھیں کو ذبح کر دے گا

مگر اِن مسلخوں پر تم فضاؤں میں

لگا کر گرگسوں کے چیلوں کوّوں کے

تواں بازو

جھپٹ کر پھوڑتے رہتے ہو

اپنی تیز چونچوں اور پنجوں سے

غریبوں کی اُن آنکھوں کو

جو مسلخ میں پھنسے ہیں ذبح ہونے کو

وہ آنکھیں کھو کے بھی

''آہٹ سے تم کو جان لیتے ہیں''

تمہیں بھی اور تمہارے خنجروں کو بھی

یہ مظلوم اب تمہارے مسلخوں کی

توڑ کر اونچی فصلیں آ گئے باہر

یہ کہتے ہیں
ہٹو ! اٹھ جاؤ کرسی سے
نہیں ہٹتے ؟
نہیں اُٹھتے ؟
نہیں اُٹھتے ؟
تو اچھا ہم اُٹھاتے ہیں
تڑاتڑ تڑ۔ تڑاتڑ تڑ

تڑاتڑ تڑ۔ تڑاتڑ تڑ

☆ ☆ ☆

سوداگر

نیتا جی ڈائس پر
مائک پکڑے چیخ رہے تھے
یہ شاسن ہے چوروں کا
رشوت خوروں کا
جنتا کا دشمن ہے
اس شاسن میں جو کرسی پر بیٹھے ہیں
ہندو کو مسلم سے
مسلم کو ہندو سے
مسلم کو مسلم سے ہی
اور ہندو کو ہندو سے ہی
آپس میں لڑواتے ہیں
یہ لاشوں کے سوداگر ہیں
لاشوں کے ڈھیر پہ چڑھ چڑھ کر
قد کو اونچا کرتے ہیں

فاسی وادی ہیں یہ

ہٹلر اِن کا ماڈل ہے

بھاشن سنتے سنتے اک لڑکے کو غصہ آیا

اُٹھ کر بولا

نیتا جی ! کل تک تم بھی تو شاسن میں تھے

کرسی سے چپکے تھے

جس دَل کو گالی دیتے ہو

اُس دل میں کل تک تم بھی تو تھے

پہچانا مجھ کو

تم نے ہی تو مجھ سے

پچھلے دنگوں سے پہلے

مسجد میں میلا پھکوا کے

مندر میں گوماس کے ٹکڑے پھکوائے تھے

☆☆☆

گودھرا

دورِ نَو آیا ہے جب سے

آ گیا ہے کچھ نیا پن

کام کرنے کے طریقے

کردیے تبدیل میں نے

سیکھ کر بہتر سلیقے

اب نہیں مجھ کو ضرورت

گوشت یا کوئی غلاظت

مسجدوں یا مندروں میں

پھینک کر دنگا کراؤں

ہر جگہ پٹرول کی افراط ہے اب

☆☆☆

حصہ سوم

مِنی کہانیاں

غیر مطبوعہ مِنی کہانیوں کے مجموعے

''فسانہ بھی حقیقت بھی''

کی منتخب کہانیاں

ا-غالب

- دو ریسرچ اسکالر بحث کر رہے تھے۔

-ایک کہہ رہا تھا مرزا غالب شیعہ تھے۔

-دوسرا ثابت کر رہا تھا کہ وہ سُنّی تھے۔

-ایک مولوی صاحب اِس بحث پر چراغ پا ہو کر بولے

''غالب شیعہ تھا نہ سُنّی ، وہ کافر تھا۔''

-مجھے ہنسی آگئی۔میں نے آہستہ سے کہا

-''غالب انسان تھا''۔

☆☆☆

۲- خودکشی

- خدانے آدم کی تخلیق کر کے مسجودِ ملائک کیا،
- پھر حوا کو پیدا کیا،
- پھر حکم عدولی کا الزام لگا کر دُنیا میں دھکیل دیا۔
- دُنیا میں آدم کے ساتھ تین چیزیں آئیں۔
- زندگی، موت اور شیطان
- زندگی ہمہ دم جدوجہد، قوتِ عمل، جذبۂ تسخیر کائنات، تخلیق، خوب سے خوب تر کی تلاش۔
- موت، بیماری، بھکمری، ناداری، قتل وغارتگری، قحط، زلزلے، آگ، لاوا، سیلاب
- شیطان منافقت، منافرت، جنگ، رنگ ونسل، احساسِ برتری اور استحصال کی شکل میں،
- شیطانوں کے ذریعہ تیار کئے گئے دُنیا کے ڈرامے کے پردے کو بہت سی تلواروں نے انسان کے خون سے رنگا،
- سکندریت
- چنگیزیت
- ہلاکو خانیت

- ہٹلریٹ
- مسولینیت
- پہلی جنگِ عظیم
- دوسری جنگِ عظیم
- ہیروشما
- ناگاسا کی
- فلسطین
- یہ سب تلواریں شیطان کی تھیں جو اُس نے ہابیل کو ہلاک کرنے کے لئے قابیل کے ہاتھ میں دیں۔
- رام داس نے غلام الٰہی کی جان لے لی۔
- غلام الٰہی آدم کی اولاد تھا۔
- دلاور خان نے موہن لال کو تہہِ تیغ کر دیا۔
- موہن لال بھی آدم کی اولاد تھا۔
- اور اِس ڈرامے میں گشت و خون کا پہلا منظر ؟
- قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل۔
- مگر اِس ڈرامے کے مصنف نے خودکشی کا کوئی منظر پیش نہیں کیا۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کر کے نصف نسلِ آدم کو ہلاک کر دیا۔
- میں سوچا ہوں قابیل خودکشی کر لیتا تو کیا بُرا تھا۔

☆☆☆

۳- تین روپ

- میرے کمرے میں ایک گوریّا نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔
- میں دیکھتا تھا کہ اکثر باہر سے کچھ چڑیاں آتیں اور میرے کمرے کی چڑیا اور چروٹے سے خوب لڑتیں، خوب جنگ ہوتی کبھی کبھی گتھم گتھا ہو کر نیچے گر پڑتیں۔
- ایک بار ایسی خونریز جنگ ہوئی کہ میرے کمرے کی چڑیا کی ایک آنکھ پھوٹ گئی، مجھے بہت دُکھ ہُوا۔
- ایک دن میں نے چڑیا سے بنائے مخاصمت دریافت کی تو چڑیا نے بتایا کہ باہر کی ایک چڑیا اُس کے گھونسلے پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتی ہے۔
- مجھے سخت حیرت ہوئی کہ یہ انسانی فطرت چڑیا میں بھی موجود ہے۔
- ایک روز چڑیوں میں جنگ ہو رہی تھی کہ میں نے دیکھا میرے نیم کے درخت پر کوّے کے گھونسلے میں ایک کوئل انڈے دے کر مائلِ پرواز تھی۔

- میں سوچنے لگا ایک چڑیا جان کی قیمت پر بھی اپنا نشیمن چھوڑنا نہیں چاہتی اور ایک چڑیا کا مقصدِ حیات نہ نشیمن ہے نہ بچے۔ فقط منزلِ بے نام کی جستجو۔ پرواز ہی پرواز، سفر ہی سفر، دشت بہ دشت، فضا در فضا، چمن در چمن۔

- میں اپنے گردوپیش اور خود کو دیکھنے لگا۔

- میں نے دیکھا میں اپنے ہی مکان میں قید ہوں۔

- میرے پیروں میں خود ساختہ اور خود انداختہ زنجیریں ہیں۔

- وہ قیدِ مکان اور زنجیریں جو مجھے اپنے اجداد سے ورثے میں ملی ہیں۔

- ایک طرف کویل، اُس کا نغمہ سرا ہجرت پسند مزاج، حُبِ نشیمن اور حبِ چمن سے قلندر صفت بے نیازی۔

- ایک طرف کوّا اور اُس کا نشیمن، پناہ گاہِ نشیمن بدوشاں۔

- ایک میں، میرا زنداں اور میری ہی زنجیریں۔

فطرت کے اِن متضاد پہلوؤں پر میں غور کرتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

۴- مَیل اور صابُن

- میں بچپن میں دیکھتا تھا کہ میرے گھر کے قریب ایک صابن بنانے کے کارخانے میں مَنوں صابن روز تیار ہوتا تھا۔
- میں سوچتا تھا اتنا صابن نجانے کتنا میل صاف کرتا ہوگا۔ ایسا کتنا مَیل ہے جسے صاف کرنے کے لئے دن رات صابن تیار ہوتا ہے مگر میل ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔
- میل کہاں سے پیدا ہوتا ہے کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے منبع پر ہی کیوں روک نہیں لگا دی جاتی۔ ایسے بہت سے سوال میرے ذہن میں اُبھرتے۔
- بڑا ہونے پر مجھے معلوم ہُوا کہ تمام دُنیا میں دن رات صابن تیار ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ میل بھی ہر وقت تیار ہوتا ہوگا۔
- یہ میل بھی عجیب حکمراں طاقت ہے جو اپنے وجود، بقا اور استحکام کے لئے ہر وقت برسرِ پیکار رہتا ہے۔
- میں سوچتا تھا کہ یہ میل دُنیا میں کب اور کس طرح معرضِ وجود میں آیا۔ پھر جیسے کسی نے میرے کان میں آہستہ سے کہہ دیا میل انسان کے ساتھ ہی فطرت کا ایک جزوِ لازم

بن کر وجود میں آیا۔

- جہاں انسان ہے وہاں میل ہے۔ جہاں میل ہے وہاں انسان ہے۔
- انسان کے ثبات کے ساتھ ہی میل کا ثبات بھی جاری ہے۔
- انسان اور میل کے ثبات کی تاریخ میں صابن کے نسخے لئے ہوئے بہت سے حکیم نظر آئے۔
- حضرت ابراہیمؑ
- حضرت نوحؑ
- حضرت موسیٰؑ
- حضرت عیسیٰؑ
- حضرت محمدؐ
- بھگوان کرشن
- گوتم بُدھ
- سب میل صاف کرنے کے صابن کے نسخے لے کر آئے مگر میل صفحہ ہستی سے ختم نہیں ہو پایا۔
- یہ میل مجھے شیطان کا ہی ایک روپ نظر آیا جو جسم سے لیکر روح تک سب کو گندہ کرتا رہتا ہے۔
- ہر صاف انسان کی طرح مجھے بھی میل سے سخت نفرت ہے۔ مگر میں نے دیکھا میں نے اپنا دامن ابھی دھویا تھا کہ پھر گندہ ہو گیا۔

☆☆☆

۵- کالے ناگ

- شنکر حمال کے گھر میں جو سیٹھ دھرم داس کے گودام پر کام کرتا تھا، ایک روز ایک کالا ناگ نکل آیا۔ شنکر نے ڈنڈا اُٹھایا اور ختم کر دیا۔
- ایک روز سیٹھ دھرم داس کی حویلی میں بھی ایک کالا ناگ نکل آیا۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا، سیٹھ جی معہ پورے خاندان کے حویلی کے بالائی حصے میں روپوش ہو گئے۔
- سانپ پکڑنے کے لئے دامُو سپیرے کو بُلایا گیا، اُس نے بین بجا کر سانپ کو پکڑ لیا اور شہر کے باہر لے جا کر چھوڑ دیا۔
- مجھے سیٹھ جی کی اِس اہنسا پر حیرت ہوئی کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ چوری چھپے گوشت بھی کھاتے تھے اور شراب بھی پیتے تھے۔
- ایک روز میں سیٹھ جی کی دُکان پر کام کر رہا تھا کہ میری نظر اُن کے بہی کھاتوں پر پڑی جس کا وہ بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ کالی روشنائی سے لکھے آڑے ترچھے خطوط مجھے کسی پٹارے میں کلبلاتے ہوئے کالے کالے ناگوں کی طرح نظر آئے۔ میں سہم گیا۔
- میں نے دیکھا بہی پر انگوٹھوں کے نشان تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہی ناگ ایک ایک کر کے ہر انگوٹھے کو ڈسنے لگے۔
- میں نے دیکھا میرے انگوٹھے سے بھی خون کے قطرے بہنے لگے۔ بدن میں زہر سرایت کر گیا۔
- میں چیخا اِن ناگوں کی تھوتھڑی کچل دو۔ اِنہیں پکڑ کر شہر کے باہر چھوڑ آؤ۔
- مگر ان ناگوں کو مارنے کے لئے نہ شنکر حمال دوڑا نہ کسی نے دامُو سپیرے کو بُلایا۔

☆☆☆

۶- پھر سفر

- میں نے ایک خواب دیکھا، بہت حسین بہت دلفریب۔
- ایک حسین باغ، باغ کے وسط میں عریض وطویل صاف شفاف نہر۔نہر کے آئینے میں مُنھ دیکھتے ہوئے دوطرفہ مہکتے ہوئے پھولوں کی قطاریں۔نہر کے دونوں طرف سبزہ زار، سرووشمشاداور پھل داردرخت۔
- جابجاپانی کے بڑے بڑے سنگِ مرمر کے حَوض اور پانی کو اُچھالتے ہوئے فوارے۔
- باغ کے بیچوں بیچ سنگِ مرمر سے تراشاہُوادودھ میں نہایاہُوا کسی دوشیزہ کے چمپئی رنگ کی طرح نکھراہُو اسفید محل۔
- محل کے اندر چاندستاروں کوشرماتے ہوئے برقی قمقمے ،ایرکنڈیشننگ، قالین، دبیز ریشمیں پردے، آبنوس اور صندل کی لکڑی سے فنکارانہ انداز میں تراشاہُوا فرنیچر، ٹیلیفون، ٹیلی وزن، لفٹ، رنگ ونور، رقص، نغمہ، ساز، موسیقی۔
- محل کے باہر باغ کا آہنی بلند دروازہ، اونچی مضبوط فصیل۔آہنی دروازے کے باہر لمبی چوڑی سڑکیں۔تیز رفتار سے سڑک کے دونوں طرف دوڑتاہُوا موٹرکاروں کا لامتناہی سلسلہ۔چوراہے پر دیوقامت کلاک ٹاور اوردوُردوُر تک فلک بوس عمارات کا گھنا

جنگل۔

- شہر کے باہر پھر آہنی دروازے اور اونچی مضبوط فصلیں۔ فصیلوں کے اندر فوج، فوجیوں کی بیرکیں ٹینک، طیارہ شکن توپیں، میزائیل، راکٹ، فینٹم، میراج، جگوار، سکھوئی لڑاکا طیارے، سمندری طیارہ بردار جہاز، پن ڈبّیاں، راڈار، کیمیاوی ہتھیار، ایٹم بم، ہائڈروجن بم۔

- اچانک سُرخ رنگ کی آتش بار تیز آندھی آئی اور ہر چیز کو آگ نے اپنے اندر لپیٹ لیا۔

- میں نے دیکھا چوراہے کے دیو قامت کلاک ٹاور کی سوئیاں اُلٹی (Anti Clock) گھومنے لگیں۔ اُن کی گردش اتنی ہوگئی کہ کچھ دیر میں ہی وہ ہزاروں سال پیچھے گھوم گئیں۔

- میری نیند کھُل گئی۔ میں نے دیکھا صبح ہو رہی تھی۔ اور میں ایک غار میں تنِ تنہا لیٹا ہوا تھا جہاں سورج کی کرنیں داخل ہو کر پیغامِ سفر دے رہی تھیں۔ باہر لق و دق صحرا کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میں آدم ہوں اور میری حوّا نہ جانے کہاں میرے لئے بھٹک رہی ہوگی۔ میں حوا کی تلاش میں نکل پڑا۔

☆☆☆

۷- طوفانِ نُوح

- ایک فایو اسٹار ہوٹل سے ایک اُلٹرا ماڈرن جوڑا نکلا۔اَمپالا کار میں سوار ہو کر باہر نکلنے لگا کہ گیٹ کے سامنے کچھ رُکاوٹ آجانے کی وجہ سے کار کو روکنا پڑا۔ایک چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی لڑکی لپکی۔ ''اللہ کے نام پر'' الٹرا ماڈرن جوڑے نے حقارت سے دیکھ کر منھ پھیر لیا۔دوسرے لمحے ہی کار فراٹے بھرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

- سڑک پر کاروں کا لامتناہی سیلاب تھا اور اِس سیلاب سے بے خبر فُٹ پاتھ کو ایر کنڈیشنڈ ہال سمجھ کر فٹ پاتھ کے شہزادے رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھے۔کوئی ہوٹل کا جھوٹا کھانا نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔کوئی ناریل سے بُنی ہوئی بانس کی کھٹیا کو سورج کی طرف کئے ہوئے اُس کے سائے میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔کچھ لوگ چرس پی رہے تھے۔کچھ عورتیں چاول اُبال رہی تھیں۔کچھ دمے اور دِق کے مریض کمبل بچھائے فٹ پاتھ کو ہسپتال بنائے ہوئے تھے جن کے آس پاس ننگے بچے کھیل رہے تھے

- اچانک شدید زلزلہ آ گیا۔

- زمین نے اپنا محور تبدیل کر دیا۔

- سورج نصف آسمان سے روشنی کی لکیر بناتا ہُوا مغرب کے بجائے مشرق میں جا کر غُروب ہو گیا۔

- چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا، پانی ہی پانی، دور کوہِ آتش فشاں پھٹنے کی خوفناک

آوازیں، آگ، لاوا، پہاڑوں کے ٹوٹنے اور بہنے کی آوازیں، دم توڑتے انسانوں کی چیخیں۔

- اور اِس آگ، پانی، سیلاب، مہیب غار اور تاریکی میں انسانی تہذیب ابد کی نیند سوگئی۔

- کئی ہزار سال بعد نئے محور پر کرہ ارض کے سنبھل جانے کے بعد دُنیا کی جغرافیائی شکل تبدیل ہو چکی تھی۔ اور پھر اور کئی ہزار سالوں کے بعد۔

- ایک اسکول میں ایک اُستاد بچوں کو انسانی تہذیب کی تاریخ پڑھا رہے ہیں۔

- ''بچو! انسان کی تہذیب کا ارتقائی سفر پتھر کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ پتھر کے دور کے بعد معدنیاتی دور آتا ہے جس میں انسان نے اپنے شکار کے ہتھیار اور کھانے پکانے کے برتن دھاتوں کے بنانا سیکھ لیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے انسان نے دوسرے معدنیات بھی دریافت کرئے اور رفتہ رفتہ تجسس اور دریافت کا یہ سفر منزل بہ منزل پیٹرول، گیس اور یورانیم تک انسان کو لے پہونچا۔''

- ایک استاد جغرافیہ کا درس دے رہے ہیں؛

''نئی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ جہاں آج ہمارا ملک واقع ہے وہاں ہزاروں سال پہلے سمندر تھا۔ جسے ہم ہمالیہ پہاڑ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں وہاں کبھی بحرِ ذخار تھا۔ وہاں دیو قامت مچھلیوں کے دیو قامت پتھرائے ڈھانچے FOSSILS آج بھی برف میں ڈبے ہوئے ملتے ہیں۔

- ایک استاد قدیم تاریخ پڑھا رہے ہیں۔

''بچو جدید تحقیق سے ثابت ہُوا ہے کہ نیل اور سندھ ندی کی وادی کی تہذیب دُنیا میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اہرام مصر کو دیکھ کر عقل یہ تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے کہ اُن کے عہد تعمیر میں جرِ ثقیل ضرور رہا ہوگا۔ موہنجدڑو اور ہڑپا میں زمیں دوز

نالیاں اور حمام کھدائی میں دریافت ہوئے ہیں۔''

- ایک دیہاتی اپنے بچوں کو قصہ سُنا رہا ہے۔

''آدی (قدیم عہد) کال میں اُڑن کھٹولے ہُوا کرتے تھے جس میں بیٹھ کر بھگوان یاترا کرتے تھے۔ اگنی بان ہوا کرتے تھے جو شترو (دشمن) پر آگ برساتے تھے۔ دشمن کے پاس بھی ایسے اگنی بان ہوتے تھے جو دوسرے اگنی بان سے ٹکرا کر نشانے پر پہنچنے سے پہلے ہی ہَوا میں اُسے نشٹ (برباد) کر دیتے تھے۔ مہا بھارت میں بھگوان کرشن نے اگنی بانوں کا اُپیوگ کیا تھا''۔

- ایک مولوی صاحب مسجد میں تقریر کر رہے ہیں۔

''جب انسان کی نافرمانیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو خدا کا قہر طوفان کی شکل میں نمودار ہُوا۔ نوحؑ نے اپنی قوم کو خدا کی طرف بُلایا مگر قوم تو دور اُن کے لڑکے نے ہی اُن کی بات نہ سُنی۔ آخر کار قہرِ خداوندی طوفان کی شکل میں نمودار ہُوا۔ سات دن اور سات راتوں تک تمام دُنیا پانی کے دبیز غلاف میں لپٹی رہی اور جب طوفان تھما تو تمام نافرماں بردار نوعِ انسانی معہ اپنی فتنہ پرور تہذیب کے ہلاک ہو چکی تھی''۔

- مولوی صاحب کی تقریر سُن کر میں مسجد سے باہر نکلا

- میں نے دیکھا سامنے کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے ایک الٹرا ماڈرن جوڑا نکلا۔ اَمپالا کار میں سوار ہو کر باہر نکلنے لگا کہ گیٹ کے سامنے کچھ رُکاوٹ آجانے کی وجہ سے کار کو رُکنا پڑا۔ ایک چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی لڑکی لپکی ''اللہ کے نام پر'' الٹرا ماڈرن جوڑے نے حقارت سے دیکھ کر مُنھ پھیر لیا۔ دوسرے ہی لمحہ کار فراٹے بھرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

- سڑک پر کاروں کا لامتناہی سیلاب تھا اور اِس سے بے خبر......؟......؟......؟

☆☆☆

۸ - قیامت

- میری ملاقات حضرت اسرافیل سے ہوگئی؛
- میں نے دیکھا وہ صور بدست مستعد کھڑے ہیں؛
- میں نے پوچھا حضرت آپ صور کب پھونکیں گے؟
- اُنھوں نے جواب دیا جب خدا کا حکم ہو جائے؛
- میں نے کہا حضرت کوئی خالق اپنی تخلیق کی ہوئی شئے کو کبھی برباد کرنا نہیں چاہتا۔ دُنیا کو فنا کرنے کا الزام بھی خُدائے پاک اپنے سر پر نہیں لے گا۔
- میں نے دیکھا کچھ بڑے ملکوں نے خود کو طاقت کا اجارہ دار بنا کر اقتدار کا تاج سر پر رکھے دُنیا کے کمزور ملکوں کو مغلوب کر کے غلام بنانے کے نئے طریقے اختیار کر لیے۔
- کچھ ملکوں نے خود کو غیر محفوظ سمجھ کر ایٹم بم ہائڈروجن بنانا شروع کر دیا۔
- دھیرے دھیرے سبھی قابلِ ذکر ملکوں نے ایٹم بم ہائڈروجن اور کیمیاوی ہتھیاروں کے ذخیرے بنا لیے۔
- پھر میں نے دیکھا ایک ملک کی ذخیرہ گاہ میں رکھ رکھاؤ کی کچھ تکنیکی خرابی کی وجہ سے اچانک اٹیم بم پھٹ پڑے۔ اُس کی شدید حدّت سے تمام ملکوں کے ایٹمی حربوں کے ذخائر بھی پھٹ گئے۔ دنیا آگ کا گولہ بن گئی۔
- چشم زدن میں دُنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ پہاڑ اور زمین روئی کے دُھنکے ہُوئے گالوں کی اڑنے لگے۔
- حضرت اسرافیل صور لئے ہی کھڑے رہ گئے۔

☆☆☆

۹- عید یوں بھی ہوگی

- اشتہار چھپا تھا کہ عید گاہ پر نمازِ عید کے بعد رحمت جی بالٹی والا اپنی نئی فلم کے لئے نئے چہروں کا انتخاب کریں گے اِس لئے آج عید گاہ پر ہر عید سے زیادہ نمازی جمع تھے۔
- جماعت کھڑی ہوئی۔ قاضی صاحب نے ایک رکعت کے بعد ہی قعدہ میں بیٹھ کر سلام پھیر دیا۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ عید کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے۔
- قاضی صاحب کے والد جو کافی بزرگ تھے اور مذہبی مسائل کی معلومات بدرجہ اتم رکھتے تھے، دوبارہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے بھی ایک رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا اور اعلان کیا کہ 2=1+1 (وَن پلس وَن اِکوَل ٹو، ٹو) دو رکعت ہو گئیں؛
- کافی لوگ خطبے اور دُعا کا انتظار کئے بغیر ہی باہر نکل پڑے؛
- عید گاہ کے باہر دروازے کے سامنے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ رحمت جی کا انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔
- ایک لڑکی عمر قریب تیس سال، رنگ سفید مگر آنکھ کچھ ترچھی، سیاہ بال مگر سورج کی کرن کی طرح اُٹھتی ہوئی ایک سفید لٹ، انٹرویو دے رہی تھی۔
- رحمت جی بولے "واہ کیا چیز ہے ایک دم فیٹ" سفید لٹ پکڑتے ہوئے بولے" چلے

گا چلے گا۔ کلر ہو جائے گا، تم کو ایشا کرنے کا ہے کہ دس ہزار روکڑی (نقد) لینے کا، پھر بمبئ بوری بندر کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ جانے کا۔ اُدھر اُترنے کا اور بالٹی والا اسٹوڈیوز، دادر کا پتہ پوچھنا۔ ٹیکسی والا پہونچا دے گا''۔

- ہر اُمیدوار کو رحمت جی نے انتخاب کی سند کے طور پر اپنے پتے کا کارڈ دیا اور پچاس ہزار روپیے لے کر بمبئ آنے کے لئے مدعو کیا۔

- اِدھر انٹرویو شروع ہی ہُوا تھا کہ اُدھر عیدگاہ کے اندر خطبہ کے بعد دُعا بھی ختم ہو چکی تھی۔

- عید کی خوشی میں ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس کی صدارت رحمت جی بالٹی والا کرنے والے تھے۔

- جس ہال میں مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا وہ وقت سے پہلے ہی کھچا کھچ بھر چکا تھا مگر معلوم ہُوا کہ باہر ایک بارات کھڑی ہے اور آج کی رات اِسی وقت کے لئے ہال ایک شادی کی تقریب کے لئے رِزرو ہے،

- ہال کے منیجر نے مائک پر حاضرین سے معذرت چاہی کہ برائے مہربانی مشاعرے والے ہال خالی کر دیں کیونکہ اُن کے لئے ہال دس بجے سے بُک ہے۔

- سامعین نیز شعرا تہذیب اور شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل آئے۔ رحمت جی اور شعرائے کرام ایک چائے خانے میں بیٹھ گئے، سامعین حضرات میدان میں کھڑے ہو گئے۔

- بارات ہال میں داخل ہوئی، بارات میں دُولھا کے ساتھ دُلہن بھی شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم چل رہی تھی جس کی ویڈیو فلم بھی بن رہی تھی۔ باراتیوں میں طرفین کے خواتین و مرد شریک تھے۔ دُولھا دُلہن کو اسٹیج پر رکھی راجہ رانی (مخصوص کُرسیاں) پر بٹھا دیا گیا

ڈولھا کے بازو سے قاضی صاحب اور دُلھن کے برابر وکیل اور گواہان بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب نے ذرا سی دیر میں بالمشافہ ایجاب وقبول کرادیا۔ دُلہن کا ایجاب ''جی مجھے منظور ہے'' حاضرین جلسہ کو بار بار مائک پر سنوایا گیا۔ نکاح کے فوراً بعد ڈولھا نے دُلہن کو دُلہن نے ڈولھا کو تازہ پھولوں کا ہار پہنایا اور حاضرین جلسہ کی جانب سے مبارکبادیاں اور تحفے بھی قبول کئے۔ اِسی دوران باراتیوں کا چائے پان بھی ہو گیا۔ بارات کے تمام لوگ سیدھے اپنے اپنے گھر یا قیام گاہ چلے گئے۔ ڈولھا دُلہن باراتیوں سے سلام ودُعا کر کے وہیں سے سیدھے ایک تھری اسٹار ہوٹل کے لے روانہ ہو گئے جہاں اُن کے لئے ایک کمرے کا انتظام شب عروسی کے لئے پہلے سے ہی کیا گیا تھا۔ ہال دس بجے سے پہلے خالی ہو گیا۔

- مشاعرہ شروع ہُوا۔
- کچھ معتبر اور مقتدر شعرا نے متعدد غزلیں مقبول فلمی دُھنوں پر سُنا کر سامعین اور بالٹی والا سے داد وتحسین حاصل کی۔
- بارہ بجے رات مشاعرہ اختتام پذیر ہُوا۔
- میں گھر پہنچا تو بیوی نے بمشکل دروازہ کھولا۔ اُن کو منھ پُھلائے ہوئے غیظ وغضب کے عالم میں دیکھ کر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔
- یکا یک بچوں کو نئے کپڑے پہنے ہوئے سوتا دیکھ کر خیال آیا۔ اُف اوہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں بالکل ہی بھول گیا کہ آج عید تھی۔

☆☆☆

۱۰- مجبوری

- سُنتے ہیں اِس چمن کی مٹی سونا اُگلتی تھی۔
- گلاب کی شاخوں پر سونے کے پھول کھلتے تھے۔
- موگرا اور چمیلی کی شاخوں پر چاندی کے جھومر جھولتے تھے۔
- طاؤس کے پروں میں یاقوت اور زمرّد ہوتے تھے۔
- چمن کے ہر پھول اور اُس کی مہک پر ہر شخص کی دسترس ہوتی تھی
- مگر جب میں نے آنکھ کھولی تو باغ اجارہ داروں کا اڈہ بن چکا تھا۔
- میں نے باغ کا چپہ چپہ چھان ڈالا،
- نہ سونے کے پھول ملے نہ چاندی کے جھومر؛
- زمین کی کوکھ سے جنم لینے والے پھول جنم لیتے ہی مرجھانے لگتے تھے مگر اجارہ دارانِ چمن اتنی سی دیر میں ہی اُن کا شباب لوہے اور پتھر کے باٹوں سے تول دیتے تھے۔
- مجھے اپنی مراد کی ایک کلی بھی نہ ملی۔
- کہیں تمناؤں کے تخم بونے کے لئے بھی جگہ نہ ملی۔
- ایک روز باغ کی اک روش پر میں کسی فکر میں ڈوبا ہوا ٹہل رہا تھا کہ مجھے راستے میں

ایک مکڑی ملی جو دو درختوں کے درمیان جالا تان کر راستے میں رُکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔

- اُس نے میرا راستہ روک دیا اور مجھے اِس طرح دیکھا جیسے میں کوئی مچھر ہوں؛

- میں سہم کر رُک گیا؛

- مجھے اُس کی غضب ناک آنکھوں سے خوف محسوس ہوا اور ایسا لگا جیسے وہ مجھے اپنے جال میں پھانس کر مار ڈالے گی اور میرا خون چوس لے گی؛

- میں لوٹ گیا اور گھر جا کر بستر پر لیٹ گیا؛

- میں نے دیکھا کھٹملوں نے میرا خون چوسنا شروع کر دیا؛

- مچھروں نے بہ آواز دُہل چاروں طرف سے مجھ پر یلغار کر دی۔

- مجھے اپنی مجبوری اور بے بسی پر بہت افسوس ہُوا

- میں نے سوچا کھٹملوں کو ماروں مگر کتنے کھٹمل ماروں۔ مچھروں کے حملہ کا مقابلہ کروں تو کیسے کروں؛

- اور میں خود نہ مچھر نہ بن سکتا تھا نہ کھٹمل؛

- مکڑی بن کر بھی نہ کسی کا راستہ روک سکتا تھا نہ کسی کو پھانس سکتا تھا۔

☆☆☆

۱۱- وقت کی ڈھول

- میں نے تمہیں دیکھا، بہت نزدیک سے؛
- تمہارے گالوں، سُرخ ہونٹوں اور جھیل کی طرح گہری آنکھوں کو میں نے اپنی جنت کی شکل میں دیکھا؛
- تمہارے حُسن کو شعر کا قالب پہنانے کے لئے میں نے سیکڑوں راتیں جاگ کر گزاریں؛ مگر
- میرے شعر پھیکے اور بے مزہ رہے؛
- میں نے اُنہیں پھاڑ ڈالا؛
- پھر تمہارے حُسن کی پرچھائیاں الفاظ میں تلاش کرنے کی فکر میں میرؔ سے لے کر مجازؔ اور اخترؔ شیرانی کے تمام دیوان اُلٹ ڈالے تمہارے حُسن کی ترجمانی کہیں نہ ملی؛
- میں نے رنگ اور بُرش کی مدد سے کاغذ میں جان ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا؛
- پھر میں نے محسوس کیا کہ تمہارے حسن کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔
- تم بُوئے گُل ہو اور بُوئے گل کو نہ کینواس میں قید کیا جاسکتا ہے نہ الفاظ میں؛
- حُسنِ فطرت کے بیان کے لئے ماہر فنکاروں کے قلم بے اثر اور اُنگلیاں بے جان

ہیں۔

- پھر وقت کے پہیئے نے تیز گردش کی؛

- ایک آندھی آئی اور گرد وغبار کے بیٹھنے پر میں نے دیکھا تمہارے بالوں پر وقت کی

دُھول جم چکی ہے؛

- آنکھوں کی جھیلوں کا پانی خشک ہو چکا ہے؛

- بُوئے گُل پرواز کر چکی ہے؛

- میری جنت کی منڈیروں پر کالی ہوائیں سائیں سائیں کر رہی ہیں......

- میں نے اپنے کھنڈر کو کھودنا چاہا؛

- پُرانے قلم اور سوکھے ہوئے رنگوں کو تلاش کرنا چاہا؛

- اُڑے ہوئے رنگوں اور گم گشتہ بوئے گل کو فضا سے پکڑ کر پھر دل ودماغ مین

قید کرنا چاہا؛

- مگر قلم سڑ چکے تھے؛

- رنگ بے رنگ ہو چکے تھے۔

- کاغذ کو دیمک چاٹ چکی تھی۔

- میرے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔

- جسم پر لاکھوں من وقت کی دُھول جم چکی تھی؛

- اور میں دبا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

۱۲- شکست

- مجھے اپنا پیالہ بہت ہی پسند تھا؛
- نازک، حسین، دلفریب، جاذب نظر؛
- اُسے دیکھ کر ہی میری آدھی تشنگی دور ہو جاتی تھی؛
- میں اُس پیالے کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بہت ہی تسکین اور لذت محسوس کرتا تھا اور انہماک کے عالم میں اُسے ہونٹوں سے لگائے رہتا تھا؛
- ایک روز وہ پیالہ فرش پر گر پڑا؛
- اُس کا نازک جسم پاش پاش ہو کر بکھر گیا؛
- ٹوٹ کر بکھرتے وقت اُس کے ایک ایک ٹکڑے سے بڑی دلدوز چیخیں فضا میں اُٹھیں اور خاموش ہو گئیں۔ایسا لگا جیسے ایک ستار کا تار تھرتھرا کر خاموش ہو گیا ہو؛
- میرے ساتھی نے جلد ہی اُن ریزوں کو اُٹھا کر پھینک دیا؛
- تھوڑی دیر پہلے تک ہونٹوں سے لگ کر روح کی گہرائیوں تک اُتر کر دل و جاں کو تسکین دینے والا پیالہ اب خطرہ بن چکا تھا، مبادا کوئی ریزہ پیروں کو زخمی کر دے؛
- میں دفعتاً ہیئیت کی اِس تبدیلی پر سخت حیران تھا؛
- پیالہ شکست سے پہلے بھی شیشہ تھا اور شکست کے بعد بھی شیشہ؛
- پھر کسی نے جیسے میرے کان میں کہا؛
- شکست کا دوسرا نام موت ہے؛
- میں نے دیکھا دُور ایک باپ اپنے بیٹے کا جنازہ اُٹھائے قبرستان جا رہا تھا۔

☆☆☆

۱۳- شکستِ آرزو

- میں ایک باغ کی روِش سے گذر رہا تھا؛
- روِش پر مولسری کے پھولوں کی چادر سی بچھی تھی؛
- میں نے احتراماً اُن پر پیر رکھنے سے گریز کرنا چاہا مگر پامالی سے اُنہیں نہیں روک سکا؛
- دفعتاً میری نظر ایک گلاب کے پیڑ پر پڑی جس پر دو پھول مہک رہے تھے؛
- میں اُن کی شادابی اور حُسن سے مسحور ہو گیا؛
- میں نے اُنہیں اپنے گلدان کے لئے توڑنا چاہا مگر مجھے اُن کی بے زبانی پر ترس آ گیا؛
- میں اُن پھولوں کی سحر آگیں خوشبو کا لطف لیتے ہوئے گذر گیا؛
- میں اُن پھولوں کے حُسن سے مسحور ہو چکا تھا؛
- مجھے رات بھر نیند نہیں آئی؛
- صبح ہوتے ہی میں اپنا گلدان لئے اُس روِش پر پہونچا؛
- میں نے دیکھا ایک شاخ ننگی ہو چکی تھی؛
- دوسری شاخ کا پھول اپنے ہی گہوارے میں خشک ہو کر بکھر چکا تھا؛
- میں نے گلدان توڑ دیا۔

☆☆☆

۱۴- جائداد

- میرے کمرے میں ایک چڑیا کے جوڑے نے گھونسلہ بنا رکھا تھا؛

- میں دیکھتا ہر چھٹویں مہینے چڑیا انڈے دیتی تھی؛

- بچے نکلتے تھے؛

- پھر دونوں مل کر دن رات محنت کر کے اُنہیں پالتے تھے؛

- پھر اڑنا سکھاتے تھے؛

- پَر آنے کے بعد بچے ایک دن پھُر سے اُڑ جاتے اور ماں باپ کو پلٹ کر بھی نہ دیکھتے۔

- ایک دن میں نے چڑیا سے پوچھا کہ تمہارے بچے تمہارے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔

- چڑیا نے جواب دیا "ہمارے پس کوئی جائداد ہے نہ اثاثہ"۔

- میں اپنی بچوں کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

۱۵- رُخسار کے ٹکڑے

- کالج کا سالانہ جشن تھا؛
- اسٹیج پر سرسوتی کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی؛
- تصویر کے ہر گوشے سے علم وادب کی سنہری کرنیں پھوٹ رہی تھیں؛
- دودھ کی طرح صاف، شفاف سفید رنگ کا ہنس، اُس پر وِینا کے تاروں کو گدگداتی ہوئی سرسوتی کی خوبصورت اُنگلیاں؛
- سرسوتی نے مجھے اپنی طرف مائل کرلیا؛
- مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گا رہی ہو؛
- اے ترکہ ’آدم کے وارث!
- تو نے دُنیا کے لئے جنت کو تیا گا؛
- شاید اِس لئے کہ وہ جنت خُدا کی بنائی ہوئی تھی؛
- اور تو دُنیا کو اپنے عمل سے جنت بنانا چاہتا تھا؛
- محنت اور عمل کا علم حاصل کر کے
- بغیر عمل اور بغیر محنت کے خُدا کی عطا کی ہوئی جنت بھی تجھے قبول نہ تھی؛
- مجھے محسوس ہُوا جیسے سرسوتی کی وِینا کے تاروں میں زندگی کا پیغامِ عمل ہو؛
- زندگی ہنس کی سبک روی کی طرح مائل بہ خرام ہو؛
- میرے محسوسات کا تسلسُل اچانک تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے شور سے ٹوٹ گیا؛
- اسٹیج پر تقریری مقابلہ شروع ہو چکا تھا، عنوان تھا......

”ایٹم برائے امن“

- میرا ایک طالب علم ساتھی بول رہا تھا، ایٹم کے استعمال کو صرف پُرامن مقاصد کے حصول تک ہی محدود نہیں رہنے دینا چاہیئے ؛ مجھے نشتر سازی آتی ہے اور میرے ہاتھوں میں نشتر بھی ہے۔ نشتر سے عملِ جراحی کا کام لے کر میں زندگی کی بقا کا پیغام بھی بن سکتا ہوں اور اگر میرے اندر کا شیطان جاگ اُٹھے تو اُسی نشتر کو خنجر کے طور پر استعمال کر کے میں زندگی پر ملک الموت کا سایہ بھی ڈال سکتا ہوں ؛
- زندگی کی بقا اور اُس کی حفاظت کے لئے یہ نشتر ڈھال بھی ہے اور تلوار بھی ؛
- اگر میں اِسے تلوار کے طور پر استعمال کرتا ہوں تو دشمن کو میرے خلاف محاذ آرا ہونے میں پس و پیش ہوگا اور خوف بھی۔ اور میں امن سے بیٹھ سکوں گا۔
- تقاریر کا سلسلہ جاری رہی تھا کہ اچانک بلیک آؤٹ ہوگیا ؛
- ہر طرف سے سائرن کی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں ؛
- ہوائی حملے سے بچنے کے لئے باہر میدان میں کھُدی ہوئی خندقوں میں پناہ لینے کی غرض سے لوگ بے تحاشہ بھاگ رہے تھے ؛
- میں بھی ایک خندق میں چھپ گیا ؛
- دشمن کا ہوائی حملہ شروع ہو چکا تھا۔ دشمن کے بمبار طیارے بموں کی شکل میں تلواریں برسا رہے تھے۔ اِدھر زمین سے ہوا میں مار کرنے والی اینٹی ایر کرافٹ میزائلیں ڈھال کی شکل میں اپنا کام کر رہی تھیں۔ اندھیرے میں بموں کے پھٹنے کی روشنی بجلی کی چمک اور کڑک پیدا کر رہی تھی اور اندھیرے میں میں نے دیکھا میرے کالج کی عمارت زمیں بوس ہو چکی تھی اُدھر ہوسٹل کی عمارتیں شعلے اگل رہیں تھیں ؛
- خندق میں میری دائیں جانب ایک صاحب تھے، بدن کے تمام داغوں کو سفید لباس میں چھپائے ہوئے اور سفید لباس کو بھی ایک سیاہ لبادے میں چھپائے ہوئے، میں نے اُن کا تعارف چاہا، اُنہوں نے بتایا ”میں انسانوں کے حقوق کی حفاظت اور حصول کے لئے تلوار اور ڈھال دونوں سے کام لیتا ہوں مجھے وکیل کہتے ہیں“۔
- میری بائیں جانب بھی ایک صاحب سیاہ لبادہ پہنے ہوئے تھے اُنھوں نے اپنا تعارف

کرایا۔

’’میں علم کو سورج کی کرنوں کی طرح دُنیا میں پھیلاتا ہوں، میں خنجر سازی کی بھی تعلیم دیتا ہوں اور سپر سازی کی بھی، میرا بخشا ہُوا علم کبھی داروئے مرض بن کر انسان کی حلق کے نیچے اُتر کر زندگی کا پیغام دیتا ہے کبھی مئے ناب بن کر رندوں کو فرحت اور سُرور بخشتا ہے مجھے پروفیسر کہتے ہیں‘‘۔

- میں نے بھی اپنا تعارف دیا۔

’’میں کچی مٹی ہوں مجھے پکا کر حیات بخشنے والا پیمانہ بنالیجئے یا سقراط اور امام حسنؓ کی خیمۂ زندگی کی طنابیں کاٹنے والا زہر کا پیالہ بنالیجئے؛

- میں نے کہا میں کچی مٹی ہوں مجھے پکا کر قصرِ زندگی کی بنیاد بنالیجئے یا میرے بطن کے سنگریزوں سے فولاد نکال کر مجھے نشتر کی شکل دیجئے یا خنجر کی، یا میرے خاکریزوں میں جوہری توانائی تلاش کر کے مجھے ملک الموت بنادیجئے۔

- ہوائی حملہ ختم ہو چکا تھا، لوگ خندقوں سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ میں گرلز ہوسٹل کی طرف دوڑا جہاں میرے خوابوں کی شہزادی شہناز رہتی تھی؛ تھوڑی دور پر میں نے دیکھا میدان میں انسانی جسموں کے اعضا ٹکڑوں کی شکل میں بکھرے ہوئے نظر آئے۔ میں نے دیکھا ایک جگہ گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں جیسی پھیلی ہوئیں تھیں۔ مجھے اِن پنکھڑیوں میں شہناز کے رخسار کے ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے چاہا میں اِنہیں سمیٹ کر پھر عارض بنادوں۔ میں نے ہاتھ بڑھائے مگر میرے ہاتھوں میں پھول کی پنکھڑیوں کے بجائے خون میں لت پت پَر آگئے؛

- میں نے دیکھا قریب ہی ایک ہنس خون میں لت پت پڑا ہُوا دم توڑ رہا تھا،

- مگر اِس دَم توڑتے ہوئے ہنس کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے والا کوئی سِدھارتھ آج موجود نہیں تھا۔

۱۶- مسافر خانہ

- ریلوے کے ایک بڑے جنکشن پر ایک مسافر خانہ تھا جہاں مسافروں کو اپنی ٹرین پکڑنے کے لئے رکنا پڑتا تھا؛
- کوئی مسافر تھوڑی دیر کے لئے کوئی زیادہ دیر کے لئے اور کوئی بہت زیادہ دیر کے لئے رکتا تھا؛
- میں بھی اِس مسافر خانے میں پہنچا، مسافر خانہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔
- میں نے مسافر خانے میں دیکھا؛
- کچھ لوگ بے اسباب تھے؛
- کچھ لوگوں کے پاس بہت ہلکا اسباب تھا؛
- کچھ لوگوں کے پاس اتنا زیادہ اسباب تھا کہ محافظ نگرانی کر رہے تھے؛
- کچھ لوگ خور و نوش میں مصروف تھے؛
- کچھ لوگ کھانے والوں کا مُنھ دیکھ رہے تھے؛
- کچھ لوگ بھیک مانگ رہے تھے؛
- کچھ لوگ اپنے اپنے عقائد کے مطابق بھجن، کیرتن اور عبادت میں محو تھے؛
- کچھ لوگ بھجن منڈلی والوں اور بھگوان کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے؛

- کچھ لوگ اتنی تنگ جگہ میں بیٹھے تھے کہ پیر بھی نہ پھیلا سکتے تھے
- کچھ لوگ آرام سے پاؤں پسارے ہوئے بیٹھے تھے؛
- جن چندلوگوں کے پاس بہت زیادہ اسباب تھا اُنھوں نے بہت بڑی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا اور اُس میں کسی کو مداخلت نہیں کرنے دیتے تھے اور اسباب اِس طرح جما رکھا تھا جیسے اُنہیں مسافر خانہ کبھی چھوڑنا ہی نہ ہو؛
- کچھ لوگ گروہ اور ٹولیاں بنا کر تاش، شطرنج، جوئے اور چوری میں لگے ہوئے تھے؛
- کچھ لوگ بیٹھنے کی جگہ کے تنازعے پر اِس طرح لڑ رہے تھے جیسے وہ اُن کی موروثی جگہ ہو؛
- کچھ لوگ ماحول سے بے نیاز خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور اُنہیں خبر نہیں تھی کہ اُن کے آس پاس کیا ہو رہا ہے؛

کچھ لوگ گانجہ، بھنگ، افیم اور شراب میں مست تھے، مگر اِن سب میں ایک ہی بات مشترک تھی کہ یہ سب مسافر تھے اور اپنی روانگی کا وقت آنے پر مسافر خانہ چھوڑتے جاتے تھے مگر مسافر خانے کی ہماہمی . میں کوئی کمی نہیں آتی تھی کیونکہ اُن کی جگہ نئے مسافر آجاتے تھے

- میں مسافر خانے میں ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ میری روانگی کا وقت آ گیا اور میں چل دیا۔

☆☆☆

۱۷- ہَریل

- ایک ہَریل تھا؛
- قدرت کے خزانے سے اُسے بے پناہ حُسن کی دولت عطا ہوئی تھی؛
- اُسے اپنی ذات پر بہت غرور تھا؛
- وہ گردو غبار اور غلاظت سے نفرت کرتا تھا، اور زمین پر قدم تک نہ رکھتا تھا؛
- اُسے جس وقت پیاس لگتی وہ درخت کی ایک ٹہنی یا لکڑی پنجوں میں دبائے ہوئے دریا کے کنارے اُترتا اور اُسی پر بیٹھ کر پانی پیتا؛
- ایک روز وہ پانی پینے کے لئے اُترا؛
- اُس کے قریب کچھ بگلے کیچڑ پانی میں رزق کی تلاش میں کھڑے تھے؛
- ہریل اُنہیں دیکھ کر حقارت آمیز انداز میں مُسکرایا؛
- ایک بگلے نے کہا تم درختوں پر اُڑے اُڑے پھرتے ہو، دوسروں کی محنت سے لگائے ہوئے درختوں کے پھل کھاتے ہو؛
- تمہیں کیا معلوم کہ دُنیا میں وجود قائم رکھنے کے لئے کیا جدو جہد کرنا پڑتی ہے؛
- مجھے دیکھو میں دن بھر کیچڑ، پانی اور دھوپ میں کھڑا رہ کر رزق حاصل کرنے کے لئے محنت کرتا ہوں؛
- ہریل یہ سُن کر طنزیہ انداز میں ہنستا ہوا اِس طرح اُڑ گیا جیسے بگلوں کو اُڑنا اہی نہ آتا ہو؛
- ایک روز بگلوں نے دیکھا کہ کسی شکاری کا نشانہ بن کر وہی ہریل پر شکستہ زخمی حالت میں آیا اور اُن کے سامنے گر کر تڑپنے لگا؛
- جس زمین اور کیچڑ سے وہ نفرت کرتا تھا اُسی میں تڑپ تڑپ کر اُس نے دم توڑ دیا؛

☆☆☆

۱۸- سفر جاری ہے

- میں ٹرین سے سفر کر رہا تھا؛

- ایک اسٹیشن پر ایک نیا شادی شدہ جوڑا سوار ہوا ؛

- دولہن رو رہی تھی ؛

- دُولھا کے چہرے پر فاتحانہ وقار اور مسکراہٹ تھی ؛

- ایک سفر ختم ہو چکا تھا، دُوسرا سفر درپیش تھا؛

- ایک منزل چھوٹ چکی تھی، دوسری منزل کا سفر سامنے تھا؛

- کوئی بچھڑ رہا تھا کوئی مل رہا تھا؛

- سب مسافر ایک سمت رواں تھے مگر سب کی منزلیں جدا جدا تھیں؛

- میرے سامنے بیٹھا ہوا مسافر اپنی بیوی کی استھیاں گنگا میں بہانے جا رہا تھا؛

- ایک عورت ننگی کلائی بڑھائے ہوئے بھیک مانگ رہی تھی؛

- ایک سیٹھ جی پوری سیٹ پر قبضہ جمائے ہوئے توند سہلا رہے تھے۔

- کچھ لوگ ایک کے اُوپر ایک کھڑے تھے؛

- کچھ مسافر تنگی میں فرش پر بیٹھے تھے؛

- کچھ لوگ خوش گپّیاں کر رہے تھے۔

- کچھ لوگ کراہ رہے تھے؛

- کچھ خاموش تھے،، اُن میں میں بھی تھا؛

- میری جنرل بوگی کے آگے والی بوگی ایر کنڈیشنڈ تھی جس میں ایک حسین عورت کُتا گود میں لئے ہوئے صحرائی مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی؛

- ایک ٹرین،

- ایک سفر،

- ایک ہی انسان، مگر تضاد کی یہ انتہا؛

- مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہُوا،

- ٹرین رُک رہی تھی،

- میں نے دیکھا میری منزل آ چکی تھی،

- میں اُتر گیا،

- مگر سفر جاری ہے۔

☆☆☆

۱۹- پگلی ماں

لوگ اُسے پگلی ماں کہتے تھے لیکن میں اُسے پاگل نہیں مانتا تھا وہ کہاں سے آئی تھی اور کس کی ماں تھی کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہر شخص نے اُسے اِسی حالت میں دیکھا تھا۔ ادھیڑ عمر کی دلکش خدوخال کی یہ عورت سب کے لئے پہیلی تھی۔ اُس کے آدھے سفید بال کاندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ سفید رخسار مرجھائے ہوئے پھول کی طرح سکڑے ہوئے تھے آنکھوں میں دریا کی گہرائی اور متلاطم موجوں کی طرح بے چینی تھی۔ ہمہ وقت کسی فکر میں غرق شہر کے گلی کوچوں میں سر جھکائے زیرلب کچھ بولتی ہوئی گھومتی رہتی تھی۔ کوئی کہتا تھا اُس کا شوہر دنگوں میں مارا گیا کوئی کہتا تھا اُس کے سب بیٹے جنگ میں شہید ہو گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں کچھ کاغذ لئے گھومتی رہتی تھی۔ چلتے چلتے ٹھٹک کر آسمان دیکھنے لگتی اور پھر کہتی میری دُعا سے آسمان رُکا ہُوا ہے۔ میں نے ستاروں کو بجھنے سے روک رکھا ہے۔ وہ کاغذ دکھا کر لوگوں سے کہتی اگر تم آسمان کو گرنے سے روکنا چاہتے ہو تو کرو اِس کاغذ پر دستخط۔ کبھی کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اُس کے سائے کے قصیدے گنگناتی۔ پیڑ کتنا مہربان ہے یہ محبت اور فراخدلی کا نشان ہے۔ قدرت کی عظمت کا علمبردار، شجاعت کا پیکر، گرمی اور دھوپ سے برسرِ پیکار، مسافروں کا میزبان، مفت کا سائبان، اپنے پیروں پر کھڑا۔ کسی سے کھانا مانگے نہ پانی۔ قطب کی طرح اپنی جگہ پر اڑا۔ زمین میرا آنگن اور آسمان میرے گھر کی چھت ہے۔ دن میں سورج سے اور رات میں چاند ستاروں سے سجی ہوئی چھت۔ پوری دُنیا میرا کنبہ ہے۔

کبھی وہ ملٹری چھاؤنی کی طرف دوڑتی ہوئی جاتی اور دروازہ بند پا کر باہر ہی بیٹھ جاتی۔ وہ گیٹ کے نگہبان سے چیخ چیخ کر کہتی تو مجھے پہچانتا نہیں میں تیری ماں ہوں۔ مجھے اندر جانے دے۔ مجھے سب معلوم ہے دروازے کے اندر کیا ہوتا ہے۔ وہاں آسمان کو گرا کر چاند

ستاروں کو لوٹنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ ارے بے وقوفو! چاند ستارے نوچ لوگے تو اندھیرا نہیں ہو جائے گا۔ آسمان گرے گا تو کیا تم سب دب کر نہیں مر جاؤ گے۔ کبھی کہتی تم نے اسرافیل سے صُور پھنکوانے کے لئے اُنہیں اندر بند کر رکھا ہے۔ خدا کے حکم سے صور پھونکا جائے گا تمہارے کہنے سے نہیں۔ مجھے اندر جانے دو میں اسرافیل سے کہوں گی میں پاگل نہیں۔ وہ لوگ پاگل ہیں جو دروازے کے اندر رہتے ہیں جنھوں نے تم کو بند رکھا ہے۔ وہ لامذہب ہیں۔ اُن کے دھرم گرنتھوں میں انسانوں کو مارنے اور دوسروں کی زمین ہڑپنے کے طریقے لکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کہتی میرے بیٹوں کو آزاد کر دو۔ اُنہیں قتل کرنا مت سکھاؤ۔ مجھے دونوں بیٹے پیارے ہیں۔ قابیل سے کہو ہابیل کو کیوں مارتا ہے۔ کبھی کہتی میں اسرافیل کو صور پھونکنے نہیں دونگی۔ میں زندگی ہوں۔ مجھے زندہ رہنا ہے ہٹو میرے بیٹوں کو بُرے کام مت سکھاؤ اُنہیں ہابیل کی طرح نیک بناؤ قابیل مت بناؤ۔

ایک دن سرحد پر جنگ چھڑ گئی۔ چھاؤنی کے فوجیوں اور توپ خانے کو کوچ کا حکم ملا۔ پگلی ماں کو اِس کوچ کا جیسے الہام ہو گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں چھاؤنی کی طرف دوڑی۔ چھاؤنی کا دروازہ کھُلا تھا اور توپ بردار ٹینک باہر نکل رہے تھے۔ وہ دروازے کے سامنے لیٹ کر چیخنے لگی۔ میں اِن توپوں کو اپنے بیٹوں پر نہیں چلنے دونگی۔ مجھے پہچانو میں تمہاری ماں ہوں، پگلی ماں، جو تمہارے غم میں پاگل ہو گئی ہے۔ اگر تم ٹینک آگے بڑھاؤ گے تو میں خدا سے کہہ دوں گی کہ پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اِن نافرمان بردار بیٹوں کے سر پر دے مارتا کہ یہ پھر کبھی نہ اُٹھ پائیں۔ سورج کو سوا نیزے پر کر دے کہ ان کے دماغ پگھل کر باہر آ جائیں اور اگر خُدا کو یہ منظور نہ ہو تو میں کہوں گی کہ طوفانِ نوح جیسا کوئی طوفان پھر بپا کر دے اور اِن ظالموں کو غرق کر دے۔ میں نے دیکھا ایک فوجی نے بڑھ کر پگلی ماں کو کھینچ کر راستے سے جیسے ہی ایک طرف کیا وہ چیخ مار کر بیہوش ہو کر گر پڑی۔

میں نے سوچا پگلی ماں کو شاید یہ پتہ نہیں کہ ہابیل کو تو قابیل نے پہلے ہی قتل کر دیا تھا اب تو دُنیا میں سب قابیل ہی کے بیٹے ہیں۔

☆☆☆

۲۰- بہرے کان

میرے گھر کے سامنے ضلع عدالتیں تھیں۔ عدالت کے احاطے کے مشرق میں ایک مندر اور مغرب میں ایک مسجد تھی۔ مندر میں ''مانو سیوا سمیتی'' (انجمن خدام الانساں) کا دفتر تھا۔ جو غریب اور معذور لوگوں کی خدمت کو اپنا فرضِ اولیں سمجھتا تھا۔ اِسی طرح مسجد میں بھی دین اور نیکیوں کی تبلیغ کا مرکز تھا۔ میرے گھر کے برابر ہی عدالت کے سامنے ایک کھلا میدان تھا جس میں محنت کش غریبوں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں جن کے اندرون کے اجالے میں بھی تاریکی بھری رہتی تھی۔ جہاں جھونپڑیاں ختم ہوتی تھیں وہیں پولس تھانہ تھا۔

میرے شہر کے لوگ بہت سیدھے سادے بھولے بھالے تھے۔ کپڑا بُننے کا آبائی پیشہ اور محنت مزدوری کر کے عزت اور باہمی محبت سے گذر بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ یکجہتی کا نام بھی نہیں جانتے تھے لیکن عید کے میلوں اور شاہ مدار کے عُرس میں ہندو مرد اور عورتیں اِس طرح شامل ہوتے تھے جیسے کہ یہ خود اُن کی ہی تقریب ہو۔ اِسی طرح دیوالی پر مسلمان اپنے گھروں کو لیپتے پوتتے اور دیئے جلاتے تھے۔ دیوالی کے دوسرے دن ہندو مسلم مل کر پاڑے لڑاتے تھے اور ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے تھے۔ دونوں قوموں کے آپسی برتاؤ میں دِکھاوا، بناوٹ یا تصنع نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایک روز میں گھر سے دفتر جانے کے لئے نکلا۔ دور کسی جلوس کے کچھ نعرے لگانے کی آواز آ رہی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے نکّو کی پان کی دوکان پر، جو ایک مسلمان کی تھی، ماجرا دریافت کیا تو اُس نے بتایا کہ ہندوؤں نے کسی مسجد میں میلا ڈال کر ناپاک کر دیا ہے۔ مسجد کا نام اور اِس خبر کو پھیلانے والے کسی آدمی کا اَتا پتہ اُسے معلوم نہیں تھا۔ تھوڑا آگے بڑھ کر میں نے ایک چائے کے ہندو ہوٹل پر شہر میں کشیدگی اور جلوس کے بارے میں جب پوچھا تو اُس نے بتایا کہ مسلمانوں نے کسی مندر کی مورتی کھنڈت کر دی ہے۔ مندر کا نام اور اِس خبر کو پھیلانے والے کسی آدمی کا نام پتہ اُسے بھی نہیں معلوم تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ایک ہی رات میں دو واقعات ہونے پر مجھے یقین نہیں آیا لیکن واقعی ہوئے ہیں تو دونوں قوموں کے لئے بڑے شرم کی بات ہے میں یہ سوچتا ہوا دفتر پہنچ گیا۔ وہاں بھی افواہوں کا بازار گرم تھا اور حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ تین بجے دن کے معلوم ہوا کہ شہر میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا ہے۔ جگہ جگہ قتل ہو رہے ہیں کئی جگہ آتش زنی بھی ہوئی ہے۔ کوئی کہتا تھا مسلمانوں نے ہندوؤں کی دوکانیں لوٹ لیں کوئی کہتا تھا ہندوؤں نے مسجد پر حملہ کر کے وہاں مورتیاں رکھدیں۔ شہر میں دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم تھا۔

خطرناک ماحول کو دیکھتے ہوئے دفتر کے لوگوں کو گھر جانے کے لئے کرفیو پاس نہیں دیئے گئے۔ دفتر میں اور پھر ایسے ماحول میں کسے نیند آسکتی ہے لیکن میں خاص طور پر رات بھر اُس لڑکی کے لئے شدت سے تڑپتا رہا جو میرے گھر کے برابر والے میدان کی ایک جھونپڑی میں رہتی تھی اور میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ میرے دفتر جاتے وقت وہ معنی خیز زیرِلب مُسکراہٹ کے ساتھ پیار بھری نظروں سے مجھے رخصت کرتی تھی۔ شام کو

میرے لوٹنے پر اُسی ادا سے استقبال کرتی تھی۔ میرا دل اُس سے ملنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ لیکن وہ ہندو تھی اور میں مسلمان، اِس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کروں۔ رات بھر اُس کا حسین چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ صبح ۱۰ بجے کرفیو میں جیسے ہی کچھ گھنٹوں کے لئے ڈھیل دی گئی میں اپنی سائیکل اُٹھا کر تیزی کے ساتھ گھر کی طرف لپکا۔ دور سے ہی میں نے دیکھا میرا گھر جل کر بجھ چکا تھا۔ میدان کی جھونپڑیاں بھی راکھ ہو چکی تھیں۔ ہر طرف پانی سے بھیگے ادھ جلے ٹاٹ کے ٹکڑے، بلّیاں، بانس اور ٹوٹے پھوٹے مٹکے برتن پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ کچھ بھیڑ تھی۔ میں نے بھیڑ کے قریب جا کر ایک شخص سے پوچھا تو اُس نے میرے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اُس مکان کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک لڑکی جل گئی۔ میں نے بھیڑ کو چیر کر دیکھا تو رُوپا کی ارتھی تیار ہو رہی تھی۔ اُس کے جلے ہوئے چہرے کے داغ دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کے گالوں پر پیار کے اَمِٹ بوسوں کی مہر ثبت کر کے اُسے اَمر بنا دیا ہو۔ میں آنسوؤں کے پھول نذر کر کے وہیں زمین پر لڑھک گیا۔

کچھ عرصہ بعد میں نے دیکھا کہ اُس میدان میں بڑے بڑے ہاؤسنگ کامپلیکس تعمیر ہو رہے ہیں جس میں 'مانو سیوا سمیتی' کا بھی ایک کامپلیکس تھا۔ پاس ہی پولس تھانہ تھا۔ سامنے عدالت تھی۔ اِدھر مندر تھا اُدھر مسجد۔ پھر بھی جھونپڑی والے غریبوں کی فریاد نہ پولس تک پہونچی نہ عدالت کے کانوں پر جوں رینگی۔ اِن بے سہارا لوگوں کی درد بھری چیخیں اِدھر مندر کے گھنٹوں اور ناقوس کے ہنگامے، اُدھر اذان کے شور میں دب کر رہ گئیں۔

☆☆☆

۲۱- نام

میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا میں ایک جیل میں ہوں اور جس کوٹھری میں قید ہوں اُس کی ہر درو دیوار پر بہت سے نام لکھے ہیں سیاہی سے پینسل سے کوئلے سے۔ کچھ نام کسی نکیلی چیز سے پلاسٹر پر کھُدے ہُوئے بھی ملے۔ میں نے دیکھا ایک جگہ میرا نام بھی کوئلے سے لکھا ہے لیکن یہ میں نہیں تھا۔ جب میں اِس کوٹھری میں پہلے کبھی آیا ہی نہیں تو میرا نام کیسے ہوسکتا ہے۔ تو کیا وہ بہت سے لوگ جن کے نام لکھے ہیں وہ بھی نہیں آئے۔ ضرور آئے ہونگے۔ اِس کوٹھری میں آنے والا ہر شخص اپنے وجود کا نقش چھوڑ کر جانا چاہتا ہے اِس لئے ہر آنے والے نے اپنے اپنے انداز میں حاضری درج کی ہے۔ میں نے ہر نام کو بغور پڑھا لیکن میں کسی کو نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ میں خود کو بھی نہ جانتا ہوں نہ پہچانتا ہوں۔ اِس کوٹھری میں میری موجودگی ایک وہم ہے ایک خیال ہے ایک خواب ہے۔ ایک اندھے کنوئیں میں ڈوبا ہوا پتھر ہے۔ میں اِس کوٹھری سے آزاد ہو کر نکلا۔ باہر کھُلا میدان تھا جس میں ایک پیپل کا درخت تھا۔ میں نے دیکھا راہرو اِس پیپل کے سائے میں تھوڑی سُستاتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اُس کے تنے پر اپنا نام کھود کھود کے اُسے زخمی کر رکھا ہے۔ پیڑ کے نیچے ٹھہرنے والوں کو میں نے دیکھا، اُنھوں نے بھی مجھے دیکھا۔ نہ کسی نے

مجھے پہچاننا نہ میں کسی کو پہچان پایا۔ میں نے تنے پر کھدے ہوئے ایک ایک نام کو پڑھا۔ کسی نام کو بھی پڑھ کر کوئی چہرہ ذہن میں نہیں اُبھرا۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص سے پوچھا مگر وہ بھی اِن کھدے ہوئے ناموں کے بارے میں کچھ نہ بتاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میں بھی آگے بڑھ گیا۔ میں نے دیکھا ایک ایسا سوکھا ہُوا درخت کھڑا ہے جسے پہچان پانا بھی ممکن نہیں۔ اُس کے تنے پر کھدے ہوئے ناموں کا کہیں پتہ نہیں۔ راہرو اُس کے قریب سے بھی گذرنے میں ڈرتے ہیں۔ مُبادا اُن کے اوپر گر پڑے میں بھی بچتا ہُوا گذر گیا۔

آگے چل کر میرا گذر ایک قبرستان سے ہُوا وہاں بہت سی پختہ قبریں تھیں جن پر سنگِ مرمر کے کتبوں پر مرنے والوں کے نام صاف اور جلی حروف میں کندہ تھے۔ بہت سی قبریں صرف مٹی کا ڈھیر تھیں جن پر برساتی خودرو پودوں کے پھول کھِلے ہوئے تھے۔ مجھے پختہ قبروں پر بے آب وگیاہ چٹانوں کا گمان ہُوا مگر کچی قبروں پر کھِلے ہوئے پھولوں کے پیچھے مُسکراتے ہوئے چہرے نظر آئے۔

میں نے دیکھا قبروں پر کندہ نام گونگے تھے خفتگانِ قبر بہرے تھے۔ کتبے کے پتھروں کی جان نکل چکی تھی اور اُن پر کندہ ناموں کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ نام ہو کر بھی سب بے نام ونشان تھے۔

☆☆☆

۲۲- زندگی

دو طالب علم تھے دونوں میں خوب بحث ہوتی تھی۔ نفیس کہتا تھا زندگی پتھر ہے، پہاڑ کی طرح بھاری ہے۔ طوفانی تاریک رات کی طرح بھیانک اور وحشت ناک۔ چڑیل کی طرح ڈائن اور بدشکل۔ زندگی ایسا بے آب و گیاہ ریگستان ہے جس میں بھٹکنے والے پیاس سے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ زندگی کے دشت ظلمت میں روشنی کا سُراغ بھی نہیں ملتا۔ زندگی ایک کھُلا زندانِ غم ہے جو آدم و حوا کے گناہ کے پاداش میں اولادِ آدم کو ملا ہے۔

رئیس کا نقطۂ نظر تھا کہ زندگی گُلِ نوشگفتہ کی طرح حسین اور نازک ہے۔ زندگی بوئے گُل کی طرح چمنستانِ ہستی میں ہر سحر پیار کا پیغام لے کر آتی ہے زندگی شبنم کی پُھوار ہے جو عارضِ گُل پر بارنہ بن کر اُس کو شگفتگی اور نکھار عطا کرتی ہے۔ زندگی وادیٔ ابر و بہار ہے جہاں زلفِ فطرت سے پیار کی گھٹائیں برس کر پتھریلی اور بے جان زمین میں بھی قوتِ نمو پیدا کرتی ہیں جہاں برف سے ڈھکے پہاڑ مخملیں دھوپ کی گدگداہٹ سے پگھل پگھل کر میدانوں میں سیّال فرشِ مرمر بچھاتے ہیں۔ زندگی ہوا کی طرح آزاد ہے جو فضاؤں میں مَست ہو کر اپنا آنچل لہراتی پھرتی ہے۔ یہاں ابنِ آدم کسی قید قفس میں نہ ہو کر بہارِ عالم کا لطف اُٹھانے اور عیش کرنے کے لئے آزاد ہے۔

نفیس کہتا زندگی ایسا خنجر ہے جو ہر وقت ہر آدمی کی پشت پر خراشیں لگا کر اُسے لہولہان کرتا رہتا ہے۔ وقت کے خنجر کے زخم کبھی نہیں بھرتے اور آدمی کی لمحہ لمحہ موت ہوتی رہتی ہے۔ زندگی ایسی زہر آلودہ شراب ہے جسے پی کر ہر انسان خاموشی سے موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔ نہ زندگی موت کا ماتم کرتی ہے نہ موت زندگی کا۔ زندگی انسان کو سگریٹ کی طرح پی جاتی ہے اور اُس کے وجود کو راکھ کر دیتی ہے۔ انسان جسے زندگی سمجھتا ہے وہ دراصل اُس

کے جل کر راکھ ہو جانے تک کا وقفہ ہے۔

رئیس کہتا زندگی جنت ہے۔ انسان کی اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی جنت ہے۔ یہ باغ و بہار یہ سر بفلک پہاڑ اور اُس کے دامن میں ترنم ریز آبشار، وادیاں، سبزہ ہرے بھرے جنگل، لہلہاتے کھیت غرضکہ فطرت کے یہ حسین خد و خال آدمی کے لئے دلفریب پیغامِ عشرت ہیں۔ زندگی ایک درخت ہے جو پہلے سایہ دیتا ہے پھر فضاؤں کو معطر کرتی ہوئی خوشبو پھر رَس سے بھرے ہوئے میٹھے پھل۔ زندگی شراب ہے، شباب ہے، نغمہ ہے جو روح کو تر و تازہ رکھتا ہے۔ جنت سے نکلنے کے بعد زندگی ہی وہ قطب نما ہے جو آدمی کی ابدالآباد تک رہنمائی کرتا ہے۔

ہائر سیکنڈری کرنے کے بعد نفیس اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھوپال چلا گیا۔ رئیس سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے کاروبار کی تلاش میں اپنے ننہال حیدر آباد چلا گیا۔ جہاں اُس نے بینک سے قرض لے کر اسٹیل کا بڑا کارخانہ قائم کیا۔ اُدھر نفیس کو کالج میں اپنی ہم جماعت لڑکی فائزہ سے پیار ہو گیا۔ دونوں زندگی کے سفر میں دوش بدوش چلنے کا عہد و پیماں کر کے کالج اور کلاس ہر جگہ دوش بدوش نظر آنے لگے لیکن کالج کی موسمِ گرما کی پہلی تعطیلات ہی دونوں کے لئے جدائی کا پیغام لے کر آئیں۔ چھٹیوں کے بعد ملنے کا وعدہ کر کے نفیس اور فائزہ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بارش کے آغاز میں کالج پھر کھلا مگر میگھ دُوت وِرہ کا سندیسہ لے کر آئے۔ فائزہ لوٹ کر نہیں آئی۔ معلوم ہُوا اُس کے والدین نے تعلیم ختم کر کے اُس کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف کسی بڑے صنعت کار سے کر دی۔ تعلیمی سفر کے ساتھ زندگی کے طویل سفر میں ساتھ دینے کا وعدہ کر کے یک بیک بیچ میں قطعِ مسافت کر کے فائزہ کے چلے جانے سے نفیس کی دُنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ مگر اُس نے تعلیم کو مشعلِ راہ بنا کے زندگی کے تاریک دشت کا سفر طے کرنے کا عہد کیا اور تعلیم جاری رکھی۔ بزنیس ملیجمنٹ کی ڈگری اعلیٰ نمبروں سے لینے کے بعد اُس کا تقرر حیدر آباد کے ایک بڑے کارخانے میں منیجر کی حیثیت سے ہو گیا وہ فوراً حیدر آباد جا کر کارخانے کے چیئر مین کو ڈیوٹی رپورٹ کر کے اپنے آفس چیمبر میں پہونچا اور سب سے پہلے اُس نے اپنی اسٹینوگرافر کو بُلوایا۔ چپراسی اِس کے بجائے کہ اسٹینوگرافر کو لے کر

آتا ایک پرچہ ہاتھ میں لئے ہوئے یہ کہتا ہوا آیا کہ صاحب، میڈیم یہ استعفیٰ مجھے پکڑا کے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے اپنے گھر چلی گئیں۔ نفیس نے دیکھا استعفیٰ کے نیچے لکھا تھا۔ ''کبھی آپ کی'' فائزہ کا نام پڑھ کر نفیس کا سر چکرانے لگا اور کالج کے داخلے سے لے موسمِ گرما کی چھٹیوں میں گھر جانے کے لئے رخصت ہونے تک تمام مناظر اُس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔

مگر خود کو سنبھالتے ہوئے چپراسی کو کار میں بٹھا کر فائزہ کے گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ راستے میں چپراسی نے بتایا کہ فائزہ کے شوہر نے تجارت میں بہت نقصان اٹھایا جس کے نتیجے میں کارخانہ معہ آبائی جائداد کے بک گیا۔ اُس نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے خود کو شراب وشباب میں ڈبو دیا جس کے نتیجے میں اُسے ایڈس جیسا مہلک مرض لگ گیا۔ بات یہیں تک پہونچی تھی کہ فائزہ کا گھر آ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شروع کی ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھری میں ایک پلنگ پر ہڈیوں کے ڈھانچے کی شکل میں لیٹا ہوا دیکھ کر نفیس کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل پڑی ''اوہ رئیس تم'' اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اُسے رئیس کا چہرہ مٹی کے ایک ایسے دیئے کی طرح لگا جس کا تیل سرِ شام ہی ختم ہو گیا ہو۔ جو اپنی بتّی کے اندر بچے کھچے تیل کے سہارے سے ہی ہوا کے جھونکوں کا آخری مقابلہ کر رہا ہو۔ وہ چیخا رئیس میرے دوست میرے یار یہ کیا حالات بنائی ہے۔ اِس کے بجائے کہ رئیس کچھ جواب دے اُسے ایک کھانسی کا ٹھ کا آیا۔ نفیس کو ایسا لگا جیسے یہ کھانسی نہ ہو بلکہ دیئے کی لو پر ہوا کا آخری طمانچہ ہو۔ رئیس نے اپنی سانس کو قابو میں کرتے ہوئے اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہا ''دوست! تم جیتے میں ہارا۔ زندگی انسان کو سگریٹ کی طرح پی جاتی ہے اور اُس کے وجود کو راکھ کر دیتی ہے۔ انسان جسے زندگی سمجھتا ہے وہ دراصل اُس کے جل کر راکھ ہو جانے تک کا وقفہ ہے''۔ کہتے ہوئے اُس کا چہرہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ فائزہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔

☆☆☆

۲۳- قبرستان

میں زندہ ہوں اور باقی دُنیا مردہ ہے۔نہیں نہیں میں مُردہ ہوں باقی دُنیا زندہ ہے۔نہیں نہیں میں بھی زندہ ہوں اور دُنیا بھی زندہ ہے۔ میں دُنیا سے ہوں اور دُنیا مجھ سے ہے۔دُنیا مرگئی تو میں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں۔اور میں مرگیا تو دُنیا کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ کچھ بھی ہو میں آج تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ میں مُردہ ہوں یا زندہ ہوں۔ میں اگر زندہ ہوں تو میری حالت مُردوں جیسی کیوں ہے۔شاید میں وہ مُردہ ہوں جس کا کسی محفل میں ماتم نہیں ہوتا۔ مجھے دفن کرنے کے لئے بھی کوئی نہیں آتا۔نہ کوئی فاتحہ پڑھتا ہے نہ دُرود۔ میں ابھی ابھی اپنی دفن گاہ سے نکل کر آیا ہوں وہاں مجھے اچھا نہیں لگا لیکن باہر بھی تو قبرستان جیسا منظر ہے۔

یہ دُنیا قبرستان ہے۔ کسی کی قبر مٹی کی ہے۔ کسی کی سنگ مرمر کی۔ کسی کی قبر پر سونے چاندی کے گنبد بھی بنے ہوئے ہیں۔اپنی اپنی قبروں میں کوئی مر کے دفن ہوتا ہے کوئی زندہ دفن ہو جاتا ہے۔سب کو اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔لیکن زندہ دفن ہونے والے کا حساب زندگی میں ہی ہو جاتا ہے۔ جب کہ مر کے دفن ہونے والوں کا حساب قبر میں ہوتا ہے۔ خون زندگی کی علامت ہے اور سب کے خون کا رنگ ایک سا ہے لیکن زندہ مرنے والے ہوں یا مر کے دفن ہونے والے، دونوں کے بدن میں خون نہیں ہوتا۔مرنے کے بعد میں نے دیکھا زندہ دفن ہونے والوں کی ہڈیاں بھی ویسی ہی تھیں جیسی مر کے دفن ہونے والوں کی۔ میں نے سوچا زندہ دفن ہونا بھی کیا بُرا ہے۔

☆☆☆

۲۴- جنت

ساون کی گھنگھور گھٹاؤں نے آفتاب کے شعلہ وش رخساروں کو اپنی بھیگی ہوئی زلفوں کی شبنمی پھواروں سے سرد کر رکھا تھا۔ شاخوں پر پکے ہوئے آموں اور جامنوں کی خوشبو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے مست ہوائیں چل رہی تھیں۔ امرائی میں چھپ کر بیٹھی ہوئی کویل کی کوک نے موسم کا لطف اٹھانے کے لئے بے چین کر دیا اور میں گھر سے نکل پڑا۔ گاؤں کے باہر امرائی کی محفلِ بہار میں ایک مور محوِ رقص تھا۔ اُس کی مادہ سراپا چشم بنی ہوئی محوِ نظارہ تھی۔ تھوڑے فاصلے پر میں بھی ایک درخت سے ٹک کر مور کے رقص کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا مورنی اپنی زبان میں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ جانِ من ناچے جا۔ جب تک گیلی ہوائیں چلنا بند نہ ہو جائیں۔ جب تک زمین کا دل دھڑکے اور زمین کا بوسہ لینے کے لئے اُفق پر آسمان کا سر جھکے۔ ناچے جا جانِ من ناچے جا۔ مگر میں نے دیکھا مور کے پیر سُست پڑنے لگے اور پروں کو سمیٹ کر لڑکھڑاتے ہوئے شرابی کی طرح وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مورنی نے فرطِ محبت میں اُس کے آنسوؤں کو پی کر خود آنسو بہاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ جانِ من، ناچتے ناچتے

اُداس ہوکرتمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے۔مور نے جواب دیا وہ سامنے والی حویلی کے سیٹھ جی کی بیوی کی طرح کاش تو بھی حسین ہوتی۔مورنی نے جواب دیا کاش تم میرے پیروں میں سونے کی پازیب پہنا سکتے۔کاش میرے گلے میں بھی ہیروں کا جڑاؤ ہار ہوتا۔طلائی اورنقرئی گوٹے ٹھپّے سے میرے کپڑے مرصّع ہوتے۔میرے سر پر بھی موتیوں کا دمکتا ہوا تاج ہوتا پھر دیکھتے میرا حُسن۔میرا جی چاہا کہ میں فوراً گاؤں لوٹ جاؤں اور اعلان کردوں کہ اے لوگو ! جنت یہیں ہے۔جنت کے لئے مرنے کی نہیں جینے کی ضرورت ہے۔ہم آدم وحوّا کی اولاد ہیں۔آؤ ہم بھی اپنے اپنے کپڑے نوچ پھینکیں۔اپنے اندراور باہر کی تمام مصنوعی چیزوں کونکال پھینکیں سب قدرتی لباس میں رہیں، قدرتی فضا میں زندہ رہنا سیکھیں تو دُنیا میں ہی جنت ہے۔قدرت کے خزانے میں ہر شخص کے لئے دولت ہی دولت ہے۔چلو ہم بھی قدرت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر مور کی طرح گھنگھور گھٹاؤں کے سائے میں مست ہوکر ناچیں، گائیں اور جنت کا مزہ لوٹیں۔پھر مور کو سیٹھانی کی سج دھج دیکھ کر اُداس ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

☆☆☆

۲۵- دوزخ

دشتِ عالم میں نزول کے بعد آدم وحوا کے ملاپ کی یہ پہلی صبح تھی۔دونوں نے دور دُور تک دیکھا۔آدم نہ آدم زاد۔لق ودق صحرا، ریگستان، جنگلی جانور خوفناک آوازیں۔دونوں کو دُنیا میں اچھا نہیں لگا کیونکہ وہ جنت کے عادی تھے۔ایک دن دونوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ہم دنیا کو بھی جنت کی طرح بنائیں۔اوردونوں دُنیا کو گلگشتِ جنت بنانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔اولادِ آدم کے دُنیا میں پھیلنے کے ساتھ نئی نئی جنتیں بنتی رہیں۔

خوب سے خوب تر جنتیں بنتی رہیں۔مگر کچھ طاقت ور آدم زادوں نے جنتوں کو اپنی ملکیت بنانا شروع کردیا۔ملکیت کے سَاتھ ملک بنا۔ملک سے مُملکت۔مملکت سے ملوک اور ملوک سے مملوک پیدا ہوئے۔مملوک مغلوب، مغلوم اور غلام بن گئے۔جنت کا تصور دوزخ کے ساتھ ہوتا ہے اِس لیے مملوکوں کے لئے دوزخیں تیار ہوئیں۔

دوزخ میں رہنے والوں کا کام جلنا ہے اور ملوک کا کام جلانا۔ملوک کا فرمان صادر ہوا۔جھونکدو اِن دوزخیوں کو سکندروں کے اقتدار کی بھٹی میں۔تاج محل تعمیر کرکے ہاتھ کٹوانے کے لئے۔نادرشاہوں، ہٹلروں کے قتلِ عام میں مرنے کے لئے۔بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے۔

یہ دوزخ دہک رہی ہے۔یہ دوزخ دہکتی آئی ہے۔یہ دوزخ دہکتی رہے گی۔انسان سے شیطان کی مخاصمت روزِ اول سے ہے۔نیکی کے ساتھ بدی کا وجود لازم ہے۔جنت کے ساتھ دوزخ کا وجود بھی ضروری ہے۔مگر یہ ابنِ آدم کی دُنیا ہے یہاں ہر رواج الٹا ہے۔یہاں گناہگاروں کے لئے جنت اور نیک اعمال والوں کے لئے دوخ ہے۔

☆☆☆

۲۵- پھلواری

- ایک پھلواری تھی جس میں کئی قسم کے پھول کھلتے تھے؟
- گلاب، موگرا، چمیلی، جوہی، مدھوکامنی، گلِ داؤدی؛
- ہر قسم کے پھولوں کے لئے الگ الگ کیاریاں تھیں؛
- کچھ اور بھی پھولوں کے درخت تھے، چمپا، رات رانی، مولسری، ہار سنگھار؛ جن کے لئے کوئی کیاری مخصوص نہیں تھی۔
- ایک لان (سبزہ زار) بھی تھا جس کی زمیں ہری ہری مخملی گھاس سے ہمیشہ ڈھکی رہتی تھی۔
- پھلواری کے اندر ہی ایک کنواں بھی تھا جس کا پانی بغیر کسی امتیاز کے سب پیڑوں کی جڑوں کو یکساں سیراب کرتا تھا۔
- ایک مالی تھا جو پھلواری کے سب پیڑ پودوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔
- پھلواری کے ایک کونے میں کچرا ڈالنے کی جگہ تھی جہاں سوکھے پتے، گھاس پھوس کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔
- پھولوں کی کیاریوں میں اکثر جنگلی گھاس پودے از خود اُگ آتے تھے
- کچرے کے ڈھیر پر بھی ناخواستہ (un-wanted) جنگلی گھاس، دھتورے

اور لگر متے اُگ آتے تھے

- میری سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ اعلیٰ قسم کے پھولوں کے پیڑوں کے علاوہ پھلواری میں غیر معیاری پھولوں کے پودوں کے پھولنے پھلنے کا حق کیوں حاصل نہیں تھا۔ میں دیکھتا تھا جنگلی گھاس اور پودوں کا وجود مالی کو مطلق پسند نہیں تھا کیونکہ موقع ملتے ہی وہ اُنہیں جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتا۔

- میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ کچرے کے ڈھیر پر اُوگے ناخواستہ پودوں سے مالی کو کیوں بغض تھا۔ یہ خودرو پودے نہ کسی سے سہارا مانگتے تھے نہ حفاظت۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے، بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی اِن میں خودکار صلاحیت تھی

- میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ ایک ہی پھُلواری، ایک ہی مٹی، ایک ہی پانی اور ایک ہی ہَوا لیکن تمام پھولوں کا نصیب جُدا جُدا تھا

- اعلیٰ ذات کے پھولوں کی قسمت بھی اعلیٰ تھی۔ رنگ، روپ، نکھار، خوشبو، ہر اعتبار سے۔ اِس لئے اُن کے شیدائی بھنورے بھی بہت تھے۔

- گھٹیا قسم کے پھولوں کی نہ شکل وصورت میں دلفریبی تھی نہ من موہنی مہک۔ پوچھ پرکھ کرنے والوں کا انتظار کرتے کرتے شاخوں پر ہی اِن کی آنکھیں پتھرا جاتی تھیں۔ ان پھولوں کے کچھ مداح ضرور تھے مگر اُن سے پیار یہ بھی نہیں کرتے تھے۔

- میں نے دیکھا جس طرح بجھی ہوئی شمع کے نزدیک بھی کوئی پروانہ نہیں آتا اُسی طرح باسی پھولوں کا بھی کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔

- میں نے یہ بھی دیکھا جن پھولوں کے دلوں میں حُبِّ چمن زیادہ تھی پامالی اُنہیں کی قسمت میں زیادہ تھی۔ مولسری، رات رانی، ہارسنگھار کے پھول جن کا کام صرف

پھلواری کی فضاؤں کو ہی معطر کرنا ہے، دُور دُور تک خوشبوؤں کے سفیر بھیج کر جس خاکِ چمن سے پیدا ہوتے تھے، شاخوں سے جھڑ جھڑ کر اُسی بوسیدہ قبائے خاک کا پیوند بنتے رہتے تھے۔ مگر اُن کی اِس حُبِّ چمن کی داد دینے والا کوئی نہیں تھا۔

- جن پھولوں کا مقدر چمن کو چھوڑ کر دیارِ غیر کو زیب و زینت بخشنا اور مہکانا ہوتا تھا اُن کا مستقبل بھی غیر یقینی تھا۔

- کون سا پھول کس مندر میں کس بھگوان پر چڑھے گا۔
- کون سا پھول کس حسین کے گجرے کی زینت بنے گا؛
- کون سا پھول کس کی سیج کی مہکانے کے لئے اپنا شباب لٹائے گا۔
- کون سا پھول کس کے جنازے پر چڑھے گا یا کس کی چتا پر نذر آتش ہوگا۔
- کوئی بھی پھول اپنے انجام سے واقف نہیں تھا۔

- میں نے دیکھا ایک پھول کو نہ مندر کے زینے پر چڑھنا نصیب ہُوا نہ کسی نازنین کی زلفوں کو مہکانا۔ نہ جنازے پر چڑھنا نہ چتا پر جلنا۔ اُس کی قسمت شاخ پر ہی پامالی کے ہاتھوں میں سوکھ کر بکھر جانا تھا۔ اِن سب پھولوں میں ایک خاص مشترک وصف تھا۔ بے زبانی،

- شاخ پر مہکنے کی صورت میں بھی فرطِ جذبات سے نہ کبھی بلبل کی طرح نغمہ آرا ہوتے ہوئے دیکھا نہ گلچیں کے ہاتھوں شکست ہونے پر نالہ وُفریاد کرتے۔

- میں نے دیکھا سر پر چڑھنے والے پھول کا انجام بھی پامالی تھا جب کہ سبزہ زار کی گھاس ہمہ وقت پامال ہو کر بھی تروتازہ رہتی تھی۔

- ایک روز گھاس نے ایک گلاب سے کہا تو اپنے حُسن اور مہک کی وجہ سے اہلِ ہوس کا شکار ہوتا ہے۔ اگر تو بھی میری طرح بے مہک ہو کر زمین سے رشتہ مضبوط کر لے تو

تیرا وجود محفوظ رہے گا"۔

- گلاب نے جواب دیا "پامال ہو کر ذلت سے پڑے رہنے کا نام نہ زندگی ہے نہ زمین سے وابستگی۔ جگنو کتنا ہی حقیر سہی لیکن وہ جس طرح برسات کی سیاہ رات کو چیلنج کرتا ہُوا تیرگی کے سینے کو چیرتا ہُوا اڑتا پھرتا ہے اُسی طرح میں بھی مہک کو پھلواری کے اندر بھی اور باہر بھی رنگ و بو اور امن و محبت کا پیغام دور دراز تک پہونچاتا رہتا ہوں۔ یہی میرا نصب العین اور مقصدِ حیات ہے۔

- گلاب اور گھاس کے بیچ میں یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ میں نے دیکھا پھلواری میں پڑے ہوئے کچرے کے ڈھیر پر اُوگے دھتوروں کے پیڑوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ مالی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا تھا اگرچہ پھلواری کے کام کاج میں یہ بالکل مُخل نہیں تھے۔

- میں نے سوچا اگر یہ بے خوشبو ہیں، خودرو ہیں، گھورے پر اوگتے ہیں یا ناپسندیدہ اور غیر ضروری ہیں تو اِس میں اِن بیچاروں کا کیا قصور۔ یہ بھی تو صناعِ فطرت کی ہی تخلیق ہیں۔

- میں سوچنے لگا جو بے خوشبو ہیں، خودرو ہیں، گھورے پر اوگتے ہیں یا عالمِ رنگ و بو کی نظر میں ناپسندیدہ اور غیر ضروری ہیں کیا پھلواری کے کنوئیں کے پانی، مٹی اور ہَوا پر اُن کا کچھ حق نہیں ہے۔

- میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے محسوس ہُوا، میں نہ گلاب ہوں نہ لان کی گھاس۔ میں بھی شاید کوئی بے خوشبو، خودرو اور غیر ضروری پیڑ ہوں جسے پھلواری کا مالی کسی پل بھی اکھاڑ پھینکے گا۔

☆☆

کوثر صدیقی کی مطبوعہ تصانیف

- ''پھول ایک ہی چمن کے'' ...... بچوں کے لیے حب وطن، قومی یک جہتی اور اخلاقی موضوعات پر لکھی گئی نظموں کا مجموعہ (اردو اور ہندی میں) 1995
  قیمت : پچاس روپے
- ''تاج المساجد کی کہانی'' بھوپال کی مشہور عالم مسجد تاج المساجد کی منظوم مختصر تاریخ، 1995ء قیمت : Rs. 5.00
- ''فصیل شب'' ...... غزلوں، نظموں اور ثلاثی کے انتخاب کا مجموعہ 1997ء قیمت : Rs. 70
- ''ساز جرس'' ...... نظموں کا مجموعہ 1999ء، قیمت -/Rs. 70
- ''نالہ جرس'' ...... نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 2000ء قیمت ایک سو روپے
- ''جیب میں پتھر'' ...... ثلاثی کا مجموعہ۔ 2001 قیمت۔ Rs. 80
- ''موجِ سبو'' ...... رباعیوں کے انتخاب کا مجموعہ 2002ء قیمت ایک سو روپے
- ''آگ'' ...... کہانیوں کا مجموعہ 2002ء قیمت : -/Rs.100

کوثر صدیقی کی غیر مطبوعہ تصانیف

- موج صبا : غزلوں کا انتخاب
- جلتا آنگن : ماہیے، مزاحیے اور ہائیکو کا انتخاب
- مفہوم الاقبال : علامہ اقبال کی ۴۸ نظموں کا فارسی میں منظوم ترجمہ
- عکس انیس : میر انیس کے دو طویل مرثیوں کا فارسی میں منظوم ترجمہ
- فسانہ بھی حقیقت بھی : افسانوں کا مجموعہ
- پہلے آپ : مزاحیہ اور فکاہیہ منظومات
- اُردو ہے جاری : اُردو اور ہندی سے تعلق سے مزاحیہ طنزیہ ثلاثی کا مجموعہ

مطبوعہ تصانیف کے ملنے کا پتا۔

Kausar Siddiqui 79-A Ginnori Main Road, Bhopal -1